اسلام اور عصرِ حاضر
عصری اسلوب میں اسلام کا تعارف
مولانا وحید الدّین خاں

مولانا وحید الدین خاں

مکتبہ الرسالہ ، نئی دہلی

فہرست

مذہب کی اہمیت

کہا جاتا ہے کہ جدید تہذیب نے مذہب کو فرسودہ اور غیر ضروری ثابت کر دیا ہے۔

وہ کیا چیز ہے جو مغربی تہذیب نے انسانیت کو دی ہے۔ وہ ہیں جدید طرز کی سواریاں۔ نئے طرز کے مکانات۔ نئے قسم کے ذرائع مواصلات۔ نئے قسم کے لباس۔ مختصر یہ کہ دنیا میں زندگی گزارنے کے لئے نئے ساز و سامان جو پچھلے سامانوں کے مقابلہ میں زیادہ آرام دہ، زیادہ خوش نما اور زیادہ سریع العمل ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس قسم کے سامانوں کا خدا اور مذہب پر عقیدہ رکھنے یا نہ رکھنے کے مسئلہ سے کیا تعلق۔

کیا کسی کے پاس جدید طرز کی رہائش گاہ اور موٹر کار ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے لئے خدا کا وجود بے معنی ہو گیا۔ کیا تار اور ٹیلی فون کے ذریعہ خبر رسانی سے وحی والہام کے عقیدے کی تردید ہو جاتی ہے۔ کیا ہوائی جہاز اور راکٹ کے ذریعہ فضا میں اڑنے کا مطلب یہ ہے کہ آخرت کا اس کائنات میں کہیں وجود نہیں ہے۔ کیا لذیذ کھانے، خوش نما لباس اور اعلیٰ فرنیچر کے وجود میں آنے کے بعد جنت و دوزخ کو ماننے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ کیا جدید عورتوں کے اندر یہ صلاحیت کہ وہ ٹائپ رائٹر کے کی بورڈ پر اپنی انگلیاں تیزی سے چلا سکتی ہیں یہ ثابت کرتا ہے کہ اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَاءِ کی آیت منسوخ ہو گئی۔ کیا اسمبلی اور پارلیمنٹ کی شاندار عمارتوں میں بیٹھ کر کچھ لوگوں کا قانون سازی کرنا یہ ثابت کرتا ہے کہ شریعت کا قانون بے معنی ہو گیا ہے۔

نئے ساز و سامان اور نئے ذرائع و وسائل کی اہمیت و افادیت کو تسلیم کرتے ہوئے ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ ان کا مذہب کی صداقتوں کی تائید یا تردید سے کیا تعلق ہے۔

مذہب کا تعلق قدروں (Values) سے ہے نہ کہ تمدنی مظاہر سے۔ تمدنی مظاہر بدلتے رہتے ہیں، مگر زندگی کی قدروں میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔ جدید طرز کی تیز رفتار سواریوں نے قدیم طرز کی سست رفتار گاڑیوں کو فرسودہ قرار دے دیا ہے۔ مگر اس مسئلہ کی اہمیت بدستور اپنی جگہ قائم ہے کہ آدمی سواریوں کو بنانے اور استعمال کرنے میں کن اخلاقی اصولوں کا لحاظ کرے۔ جدید مواصلاتی ذرائع نے قدیم طرز کے پیغام رسانی کے طریقوں کو بے فائدہ ثابت کر دیا ہے۔ مگر اس سوال کی اہمیت میں اب بھی کوئی فرق نہیں ہوا کہ ان مواصلات کو جھوٹ کی اشاعت کے لئے استعمال کیا جائے یا سچ کی اشاعت کے لئے۔

پارلیمنٹ کے ممبران خواہ پیدل چل کر پارلیمنٹ ہاؤس پہنچیں یا ہوائی جہازوں پر اڑ کر آئیں، اس اصول کی اہمیت بدستور باقی رہے گی کہ ان کی قانون سازی کا کام اسی خدائی قانون کی مطابقت میں ہونا چاہئے جس پر ساری کائنات کا نظام چل رہا ہے۔ عدالت کے دفاتر خواہ چھپر میں ہوں یا کسی عالی شان عمارت میں، یہ معیار یکساں طور پر باقی رہے گا کہ عدالتوں کو اس طرح کام کرنا چاہئے کہ کوئی شخص اپنا جائز حق لینے سے محروم نہ رہے اور نہ کوئی شخص اپنے جرم کی سزا پانے سے۔

" اسلام عصر حاضر میں "ویسا ہی ایک جملہ ہے جیسا کہ "سورج عصر حاضر میں" اسلام، بالفاظ دیگر خدا کی سچی ہدایت، ابدی حقیقتوں کا اظہار ہے۔ انسان کو اپنی زندگی کی مادی تعمیر کے لئے جس طرح سورج کی روشنی کی مستقل ضرورت ہے۔ اسی طرح اس کو اپنی زندگی کی روحانی اور اخلاقی تعمیر کے لئے خدا کی سچی ہدایت (اسلام) کی لازمی ضرورت ہے۔ جو لوگ اسلام کو نہ اپنائیں وہ گویا روحانی اور اخلاقی معنوں میں اسی نادانی کا مظاہرہ کر رہے ہیں جو وہ شخص کرے گا جو اپنی زندگی کی مادی تعمیر اس طرح کرے کہ اس نے سورج کو اپنی فہرست سے حذف کر دیا ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ سورج کے بغیر آدمی کی دنیا اندھیری ہے اور ہدایت کے بغیر آدمی کی آخرت اندھیری۔

روحانی تہذیب

بچوں کا ایک کھیل ہوتا ہے جس کا نام جگسا پزل (Jigsaw Puzzle) ہے اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ کسی چیز کی مکمل تصویر کو الگ الگ ٹکڑوں میں کاٹ دیتے ہیں۔ یہ گتہ یا پلاسٹک یا لکڑی کے ٹکڑے ہوتے ہیں۔ یہ مختلف انداز کے ٹکڑے بچوں کو دے دئے جاتے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ ان کو اس طرح جوڑ دو کہ فلاں چیز (مثلاً اونٹ) کی صورت بن جائے۔ جو بچہ ٹکڑوں کو جوڑ کر مطلوبہ صورت بنا لے وہ کامیاب کہا جاتا ہے اور جو بچہ مطلوبہ صورت نہ بنا سکے وہ ناکام قرار پاتا ہے۔

ایک اسکول میں بچوں کو جانچنے کے لئے اسی قسم کا ایک کھیل دیا گیا۔ اس میں موٹے گتہ کے بہت سے ٹکڑے تھے۔ ان کو جوڑ کر ہندستان کا نقشہ بنانا تھا۔ بچے ٹکڑوں کو ادھر ادھر جوڑتے رہے۔ مگر ہندستان کی مکمل تصویر کسی طرح نہ بن پاتی تھی۔ آخر ایک طالب علم کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ "ممکن ہے ان ٹکڑوں میں کہیں کوئی اشارہ موجود ہو" یہ سوچ کر اس نے ایک ٹکڑے کو الٹ کر دیکھا تو اس کے پیچھے ہلکی سیاہی سے "آسام" لکھا تھا۔ اب اس کو ایک سراغ مل گیا۔ اس کے بعد اس نے مزید ٹکڑے اُلٹے تو ہر ایک پر ملک کی کسی نہ کسی ریاست کا نام دھندلے حروف میں درج تھا۔ اب وہ راز کو سمجھ گیا۔ اس نے جان لیا کہ ہر ٹکڑا کسی نہ کسی متعین ریاست کی نمائندگی کر رہا ہے۔

بچّہ کے ذہن میں ہندستان کے مجموعی نقشہ کا تصور پہلے سے موجود تھا۔ اس نے اس اجمالی تصوّر کے مطابق ٹکڑوں کو جوڑنا شروع کیا۔ اب فوراً ہی ہندستان کا نقشہ بن کر تیار تھا۔ یہ طالب علم کامیاب ہوا اور بقیہ تمام طالب علم ناکام قرار دیدئے گئے۔

ایسا ہی کچھ معاملہ اس دنیا کا ہے جس کے بنانے والے نے اس کو بنا کر انسان کو یہاں رکھا ہے۔ یہ دنیا بھی ایک قسم کا جگسا پزل کا کھیل ہے۔ انسان کا امتحان یہی ہے کہ وہ یہ کھیل کھیلے اور اس میں کامیابی حاصل کرے۔

انسان کو مشین کی ضرورت تھی۔ اس کو خود کار سواریوں کی ضرورت تھی۔ اس کو آرام دہ مکانات کی ضرورت تھی۔ اس کو بے شمار دوسری مادی چیزیں درکار تھیں۔ مگر قدرت نے ایسا نہیں کیا کہ ان چیزوں کو بنا بنایا آسمان سے اتار دے۔ اس دنیا میں ہوا اور پانی اور روشنی جیسی چیزیں تو موجود ہیں مگر ٹائپ رائٹر موٹر کار اور رہائشی بنگلے کہیں تیار شدہ حالت میں موجود نہیں۔ ان چیزوں کو آدمی خود بنا کر تیار کرتا ہے۔

ان کو بنانے کی صورت کیا ہوتی ہے. وہ یہ کہ قدرت نے ان کے تمام اجزا رخام شکل میں زمین پر پھیلا دیئے۔ کچھ چیزوں کو زمین کے نیچے دفن کر دیا۔ یہ گویا ایک عظیم جگسا پزل کے بہت سے ٹکڑے ہیں جو دنیا کے مختلف حصوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ اب انسان کے ذمہ یہ کام ہے کہ وہ ان کو تلاش کر کے حاصل کرے اور ان کو جوڑ کر بامعنی چیزیں بنائے۔

جدید مادی تہذیب کی صورت میں انسان نے بے شمار نئی نئی چیزیں بنائی ہیں۔ یہ سب چیزیں اگرچہ مکمل طور پر ہماری اس دنیا کے سامانوں سے بنی ہیں مگر ان میں سے کوئی چیز بھی اپنی موجودہ تکمیلی صورت میں کہیں موجود نہیں تھی۔ انسان نے ان کے مختلف بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو جمع کیا اور لمبے تجربے کے بعد ان کو جگسا پزل کی طرح جوڑ کر بامعنی چیزوں کی صورت میں تبدیل کرنے میں کامیاب ہوا۔ اسی عمل کے نتائج ہیں جن کو ٹیلی فون، کار اور فرنیچر کہتے ہیں۔

یہ ہماری مادی تہذیب کا معاملہ تھا۔ ایسا ہی کچھ معاملہ ہماری روحانی تہذیب کا بھی ہے۔ دونوں جگہ قدرت نے ایک ہی نمونہ کو ہمارے لئے پسند کیا ہے۔ روحانی دنیا کی تعمیر کا معاملہ بھی ایک قسم کے جگسا پزل کا معاملہ ہے۔ مادی دنیا کی تعمیر کے لئے قدرت نے ہمارے چاروں طرف مادی ٹکڑے بکھیرے تھے۔ یہاں قدرت نے اسی طرح بہت سے معنوی ٹکڑے ہمارے چاروں طرف بکھیر دئے ہیں۔ اسی کے ساتھ ہر ٹکڑے پر مخفی اشارات بھی درج ہیں۔ انسان کا امتحان یہ ہے کہ وہ ان اشارات کو پڑھے اور ان کے مطابق مختلف ٹکڑوں کو اپنے اپنے مقام پر جوڑ کر صحیح اور بامعنی تصویر بنائے۔

یہی موجودہ دنیا میں آدمی کا اصل امتحان ہے۔ آدمی کو بہر حال یہاں اس امتحان میں کھڑا ہونا ہے کہ وہ ان ٹکڑوں پر لکھے ہوئے مخفی اشاروں کو پہچانے اور ان کے مطابق بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو جوڑ کر مطلوبہ تصویر بنائے۔ مادی تہذیب کی تعمیر میں اگر انسان قدرت کے اس نہج کی پیروی نہ کرتا تو اس کو کبھی جدید طرز کا جگمگاتا ہوا شہر دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ اسی طرح اگر وہ روحانی تہذیب کی تعمیر میں سنجیدگی کے ساتھ اس نہج کی پیروی نہ کرے تو اس کے لئے یہاں ناکامی کے سوا کوئی اور چیز مقدر نہیں۔

انسان کی تمام گمراہیاں اسی مخصوص جانچ میں ناکام ہونے کا نتیجہ ہیں۔ انسان مادی تہذیب کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو جوڑ کر ان کا جگسا پزل بنانے کے معاملہ میں انتہائی سنجیدہ تھا اس لئے وہاں وہ پوری طرح کامیاب ہوا۔ اس کے برعکس روحانی تہذیب کے معاملہ میں وہ پوری طرح سنجیدہ نہیں۔ اسی لئے اس دوسرے میدان میں ہم دیکھتے ہیں کہ انسان صحیح طور پر اپنا جگسا پزل بنانے میں کامیاب نہیں ہوتا۔

شرک، الحاد اور دوسرے تمام غلط قسم کے فکری نظام اسی لئے وجود میں آئے کہ انسان قدرت کے مختلف ٹکڑوں پر لکھے ہوئے اشارات کو پڑھ نہ سکا اور ان کو اِدھر کا اُدھر اور اُدھر کا اِدھر جوڑ دیا۔ مثال کے طور پر مظاہر کائنات میں تنوع کو دیکھ کر اس نے خدائی میں تنوع کا عقیدہ قائم کرلیا۔ اس نے کہا کہ جب چیزیں کئی ہیں تو ان کے خدا بھی کئی ہونے چاہئیں۔ حالانکہ مظاہر کائنات میں تنوع خدا کی صفات میں تنوع کی علامت تھی نہ کہ خود خدائی میں تنوع کی علامت۔ اسی طرح کائنات میں نظام تعلیل (Causatian) کی دریافت کو اس نے خدا کی دریافت کے ہم معنی سمجھ لیا۔ حالانکہ وہ خدا کے طریق کار کی دریافت کے ہم معنی تھا نہ کہ خود خدا کی دریافت کے ہم معنی، وغیرہ۔

اب دیکھئے کہ ان ٹکڑوں پر کس قسم کے اشارات لکھے ہوئے ہیں اور کس طرح انھیں بامعنی طور پر جوڑا جاسکتا ہے۔ جب ہم اس نظر سے انسان اور کائنات کے معاملہ پر غور کرتے ہیں تو مختلف رہنما چیزیں ہمارے سامنے آتی ہیں۔ مثلاً ہنسی۔ اس کائنات میں صرف ایک انسان ہے جو ہنستا ہے۔ ہنسنے کی طاقت ہوا اور پانی، جنگل اور پہاڑ، چاند اور ستارے، کسی چیز میں نہیں۔ حتیٰ کہ جانوروں اور پرندوں میں بھی نہیں۔ ہنسنا انسان کی انتہائی امتیازی خصوصیت ہے۔ ہنسنا شعوری لذّت کی علامت ہے اور لذّت کا شعور انسان کے سوا اور کسی کو حاصل نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہماری معلوم کائنات میں انسان ہی ایک ایسی ہستی ہے جس کے لئے ہنسی (بالفاظ دیگر خوشی) مقدر کی گئی ہے۔ انسان کے سوا کوئی بھی دوسری مخلوق ایسی نہیں جو ہنسے اور خوشی منائے۔

اس کے بعد جب ہم مزید غور کرتے ہیں تو ہمیں اس جگسا پزل کا ایک اور اشاراتی ٹکڑا ہاتھ آتا ہے۔ اور وہ لذّت ہے۔ یہاں بھی ہم پاتے ہیں کہ انسان ہی ایک ایسی مخلوق ہے جو لذّت کو جانتا ہے۔ کھانا، پینا، ازدواجی تعلقات وغیرہ، بظاہر انسان اور جانوروں میں مشترک ہیں۔ مگر جانوروں کے لئے ان چیزوں میں کوئی لذّت نہیں۔ وہ جو کچھ کرتے ہیں جبلت اور ضرورت کے لئے کرتے ہیں نہ کہ لذت لینے کے لئے۔ اس کے برعکس انسان جب کھاتا پیتا ہے، جب وہ ازدواجی تعلق قائم کرتا ہے تو وہ اس سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ لطف ولذّت انسان کی امتیازی خصوصیت ہے۔ کسی بھی دوسری مخلوق کو یہ چیز حاصل نہیں۔

مذکورہ اشارات نے ہمیں کائناتی جگسا پزل کے دو ٹکڑوں کی طرف رہنمائی کی۔ ایک ہنسی اور دوسرے لذّت۔ اس سے ہم نے جانا کہ انسان کی فطرت کے اعتبار سے اس کی کامیابی یہ ہوگی کہ اس کو خوشی ملے، وہ لذّت کا مالک بن سکے۔

اس کے بعد ہم مزید مطالعہ کرتے ہیں تو ہمارے علم میں ایک اور ٹکڑا آتا ہے۔ اور وہ یہ کہ ہنسی

اور لذّت کے احساسات اگر چہ صرف انسان کو ملے ہیں۔ مگر موجودہ دنیا میں کوئی انسان ان کو پورے طور پر حاصل کرنے پر قادر نہیں۔ یہاں کی محدودیتیں (Limitations) فیصلہ کن طور پر انسان کی راہ میں حائل ہیں۔ بیماری، حادثہ، بڑھاپا، موت اور اسی طرح اپنے اندر اور باہر کی دوسری کمیاں ہماری دنیا کی زندگی کو بے مسرت اور بے لذت کر دیتی ہیں۔ ہم جو کچھ چاہتے ہیں ان کو ہم موجودہ دنیا میں حاصل نہیں کر پاتے۔

یہاں پہنچ کر جب ہم مزید غور کرتے ہیں تو ایک اور اشاراتی ٹکڑا ہمارے ہاتھ آتا ہے۔ اور وہ انسان کی یہ خصوصیت ہے کہ تمام معلوم چیزوں میں وہی ایک ایسی مخلوق ہے جو کل (Tomorrow) کا تصور رکھتا ہے۔ سورج آج ڈوبتا ہے اور کل طلوع ہوتا ہے۔ مگر سورج کو کل کا شعور نہیں۔ چیونٹی اگلے موسم کے لئے خوراک جمع کرتی ہے اور بیا اپنی آئندہ نسل کے لئے گھونسلے بناتا ہے۔ مگر چیونٹی یا بیا یہ سب کچھ جبلت (Instinct) کے تحت کرتے ہیں نہ کہ "کل" کے تصور کے تحت۔

تمام موجودات میں "کل" کا تصور صرف انسان کے اندر پایا جاتا ہے۔ یہ واقعہ ظاہر کرتا ہے کہ کل کی کامیابی صرف انسان کے لئے خاص ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جو چیز ہم چاہتے ہیں اور اپنی محدودیتوں کی وجہ سے اس کو حاصل نہیں کر سکتے وہ ہمارے لئے کل کے دن (بالفاظ دیگر مستقبل میں) مقدر کی گئی ہے۔ موجودہ دنیا میں ہم اپنی اس طلب کا صرف جزئی تعارف حاصل کرتے ہیں۔ اس کو ہم کامل طور پر صرف کل کے دور میں پائیں گے۔

یہاں پہونچ کر ایک اور اشاراتی ٹکڑا ہماری رہنمائی کرتا ہے اور وہ نیند ہے۔ ہر آدمی پر نیند طاری ہوتی ہے۔ وہ بے خبر ہو کر سو جاتا ہے۔ مگر عین اس وقت جب کہ آدمی کا جسم ایک قسم کی موت کی آغوش میں ہوتا ہے اس کا ذہن (یا روح) پوری طرح زندہ ہوتا ہے۔ آدمی کا ذہن اس وقت بھی سوچتا ہے۔ وہ سفر کرتا ہے۔ وہ فیصلے کرتا ہے۔ گویا جسمانی موت کے باوجود انسان کا ذہنی وجود پوری طرح زندہ رہتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آدمی نہ صرف کل کا تصوّر رکھتا ہے بلکہ وہ کل کے دن تک زندہ موجود بھی رہتا ہے۔ موت کے باوجود وہ ختم نہیں ہوتا۔ آدمی کی زندگی ایک ایسا تسلسل ہے جو "آج" سے لے کر "کل" تک چلا گیا ہے۔

اب ہماری تصویر حیات ایک حد تک پوری ہو چکی ہے۔ تاہم ایک چیز ابھی باقی ہے۔ وہ یہ کہ کل کا دن کس کے لئے کیا ہوگا اور کس کے لئے کیا نہیں ہوگا۔ یہاں جب ہم اپنی تلاش جاری کرتے ہیں تو دوبارہ ہم کو جگسا پزل کا ایک اور اشاراتی ٹکڑا ملتا ہے، جو ہماری تصویر کو مکمل کر دیتا

ہے۔ یہ ٹکڑا ہے انسان کے اندر خیر اور شر (صحیح اور غلط) کا تصوّر۔

معلوم کائنات میں یہ صرف انسان کی انفرادی خصوصیت ہے کہ وہ کسی چیز کو صحیح سمجھتا ہے اور کسی چیز کو غلط۔ حقیقت واقعہ کا اعتراف اس کے نزدیک سب سے بڑی نیکی ہے اور حقیقت واقعہ کا انکار اس کے نزدیک سب سے بڑی برائی اسی طرح امانت اور خیانت' احسان مندی اور احسان فراموشی' سچ اور جھوٹ' وعدہ خلافی اور بے وفائی' انصاف اور ظلم' تواضع اور سرکشی' حق کی ادائیگی اور حق کی پامالی کے درمیان وہ فرق کرتا ہے۔ وہ ایک کو صحیح اور دوسرے کو غلط سمجھتا ہے۔ یہ واقعہ انسان کے معاملہ کو دوسری مخلوقات کے معاملے سے الگ کر دیتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی کامیابی اخلاقی معیار پر جانچی جائے گی جب کہ دوسری چیزوں کی کامیابی صرف مادی اعتبار سے دیکھی جاتی ہے۔

ہمارے جگسا پزل کا یہ آخری ٹکڑا ہماری تصویر کو بالکل مکمّل کر دیتا ہے۔ اس کو ملانے کے بعد حیات انسانی کا جو کامل تصور بنتا ہے وہ یہ ہے کہ انسان ہی واحد مخلوق ہے جس کے لئے اس کے پیدا کرنے والے نے خوشی اور لذّت کو مقدّر کیا ہے۔ مگر یہ خوشی اور لذّت اس کو "آج" کی زندگی میں ملنے والی نہیں۔ یہ اس کو صرف "کل" کی زندگی میں ملے گی۔ تاہم یہ لازوال نعمت ہر آدمی کو اپنے آپ نہیں مل جائے گی۔ اس کے لئے اسے ایک امتحان میں کامیاب ہونا پڑے گا۔ وہ یہ کہ آدمی "آج" کی زندگی میں اس کے واقعی استحقاق کا ثبوت دے۔ وہ انکار حق سے بچے اور اقرار حق کی میزان پر پورا اُترے۔ وہ غلط روش کو چھوڑے اور صحیح روش کو اختیار کرے۔ وہ وقتی سطح پر جینے کے بجائے ابدیت کی سطح پر جئے۔ وہ صرف "آج" والا بن کر رہنے کے بجائے "کل" والا بن کر رہے۔ جو شخص ایسا کرے گا وہ آنے والی "کل" کی زندگی میں کامل انسان کے روپ میں ظاہر ہوگا۔ وہ اس خوشی اور لذّت کو ابدی طور پر پالے گا جس کا موجودہ زندگی میں اس نے صرف ابتدائی تعارف حاصل کیا تھا۔

مادی تہذیب وقتی دنیا کی تعمیر ہے اور روحانی تہذیب ابدی دنیا کی تعمیر۔ تاہم دونوں دنیاؤں میں کامیابی کا ایک ہی اصول ہے۔ قدرت کے متفرق اشاروں کو پڑھ کر ان سے ایک کامل نقشہ بنانا۔

موجودہ دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ جن قوموں نے قدرت کے اشاروں کو نہیں پڑھا اور قدرت کے چھپے ہوئے مواقع کو اپنے حق میں استعمال نہیں کیا وہ پچھڑی ہوئی قومیں بن کر رہ گئیں۔ ان کے حصہ میں صرف یہ آیا کہ وہ دوسری ترقی یافتہ قوموں کی سیاسی اور معاشی غلام بن کر رہ جائیں۔

اسی طرح آنے والی دنیا میں وہ لوگ کامیاب رہیں گے جنھوں نے اپنے اندر روحانی تہذیب کی تشکیل کی اور وہ لوگ برباد ہو کر رہ جائیں گے جو اپنے اندر روحانی تہذیب کی تشکیل نہ کر سکے۔ ہماری موجودہ زندگی ہماری اگلی زندگی کا تعارف ہے۔ انسان کا آج کا انجام اس کے کل کے انجام کو بتا رہا ہے۔

روسی ناول نگار دوستو وسکی (۱۸۸۱ــ ۱۸۲۱) کا ایک ناول ہے جس کا نام ہے جرم و سزا۔ اس کا ہیرو ایک بدخو، بدمزاج، کریہہ المنظر، لاولد اور بوڑھی عورت کو اس لئے قتل کر دیتا ہے کہ اس کی روز افزوں نگر بیٹے کا ر دولت کو اپنی اعلیٰ تعلیم کے حصول کا ذریعہ بنائے۔ جب یہ واقعہ ہوتا ہے تو نہ صرف ناول کے قاری بلکہ ناول کے سارے کردار اسے مجرم قرار دیتے ہیں۔

بڑھیا کی دولت اس شخص کے لئے اتنی ہی مفید تھی جتنا کسی شیر کے لئے ہرن کا گوشت۔ شیر ایک ہرن کو مار کر اس کا خون پی جائے تو کسی کو یہ بات عجیب نہیں معلوم ہوتی اور نہ اس کے لئے کوئی تعزیری قانون بنانے کی ضرورت محسوس ہوتی۔ مگر اسی قسم کا فعل ایک انسان کرتا ہے تو ساری انسانیت چیخ اٹھتی ہے اور چاہتی ہے کہ اس کو اس کے فعل کی پوری سزا دی جائے۔ صحیح اور غلط کی یہ تقسیم صرف انسان کی نفسیات میں پائی جاتی ہے۔ دوسری تمام موجودات قانون فطرت یا جبلت کے تحت عمل کرتی ہیں، وہ اس قسم کے کسی فرق سے خالی ہیں۔

اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ انسان ایک اخلاقی وجود ہے۔ وہ ہر فعل کو صحیح اور غلط کی ترازو پر تولتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ اخلاقی حدود کے اندر زندگی گزارے۔ جب کہ جانور اس قسم کا کوئی شعور نہیں رکھتے۔ جانوروں کے یہاں صرف مفید اور مضر کی تقسیم ہے نہ کہ صحیح اور غلط کی۔

اس سے معلوم ہوا کہ انسان کے لئے ایک ایسے ضابطہ کی ضرورت ہے جس میں اس کے اخلاقی شعور کے مطابق صحیح اور غلط کو متعین کیا گیا ہو۔ جانوروں کو جو ضابطہ درکار ہے وہ ابتدا سے ان کی جبلت میں موجود ہوتا ہے۔ انسان اپنے ساتھ اپنا ضابطہ نہیں رکھتا۔ یہ خلا بتاتا ہے کہ انسان کے لئے ضرورت ہے کہ باہر سے اس کو ایک ضابطۂ اخلاق فراہم کیا جائے۔ "قانون"، یہی ضابطۂ اخلاق فراہم کرنے کی ایک کوشش ہے۔ مگر اس کا یہ حال ہے کہ پانچ ہزار برس کی بہترین کوششوں کے باوجود انسانی دماغ ابھی تک اپنے لئے قانون کی کوئی متفقہ بنیاد دریافت نہ کر سکا۔

کچھ لوگ اس ناکامی کو یہ حیثیت دیتے ہیں کہ ابھی انسان اپنی تلاش کے مرحلہ میں ہے۔ وہ اپنی منزل تک نہ پہنچ سکا۔ ٹاکویلی (Tocqueville) کے یہ الفاظ اسی قسم کے لوگوں کی ترجمانی کر رہے ہیں:

A new science of politics is indispensable to a new world.

(نئی دنیا کے لئے ایک نیا علم سیاست ضروری ہے) مگر حقیقت یہ ہے کہ انسان کی ناکامی تلاش کی ناکامی نہیں بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایک ایسی چیز کی تلاش میں ہے جہاں وہ اپنی کوششوں سے پہنچ ہی نہیں سکتا۔

انسان کے اندر اخلاقی شعور ہونا مگر انسان کا خود سے اخلاقی قانون وضع نہ کر سکنا، نظام فطرت کا ایک خلا ہے۔ یہ خلا وحی کی ضرورت ثابت کرتا ہے۔ اگر ایک بار اس اصول کو تسلیم کر لیا جائے تو اس کے بعد اسلام تک پہنچنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

مذہب اور سائنس

اس وقت مجھے جس عنوان پر اپنے خیالات پیش کرنا ہے وہ ہے ـــــــ مذہب اور سائنس۔ مذہب اور سائنس دونوں بہت وسیع الفاظ ہیں۔ مذہب زندگی کا ایک تصور اور اس تصور پر بننے والے ایک ہمہ گیر طرز عمل کا نام ہے جو زندگی کے تمام پہلوؤں کے بارے میں اپنے کچھ مطالبات اور تقاضے رکھتا ہے۔ اور سائنس، اس محسوس دنیا کے مطالعہ کا نام ہے جو ہمارے مشاہدے اور تجربے میں آتی ہے یا آسکتی ہے۔ اس اعتبار سے دونوں نہایت وسیع موضوعات ہیں اور ان کے دائرے بہت سے پہلوؤں سے ایک دوسرے سے الگ الگ ہیں۔ مجھے یہاں دونوں کی تفصیلات پر کوئی بحث نہیں کرنی ہے۔ اس مقالے کا موضوع صرف وہ فرضی یا حقیقی تصادم ہے جو سائنس اور مذہب کے درمیان علمی حیثیت سے واقع ہوا اور جس کے کچھ نتائج برآمد ہوئے۔ میں مختصر طور پر صرف اس دعوے سے بحث کرنا چاہتا ہوں جس میں دہرایا گیا ہے کہ سائنس کی دریافتوں نے مذہب کو بے بنیاد ثابت کر دیا ہے۔

سائنس اور مذہب کا روایتی ٹکراؤ خاص طور پر اٹھارھویں اور انیسویں صدی کی پیداوار ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جبکہ جدید سائنس کا ظہور ہوا۔ سائنسی دریافتوں کے سامنے آنے کے بعد بہت سے لوگ یہ سمجھنے لگے کہ اب خدا کو ماننے کی کوئی ضرورت نہیں۔ خدا کو ماننے کی ایک بہت بڑی وجہ، دوسری وجہوں کے ساتھ، یہ تھی کہ اس کو مانے بغیر کائنات کی توجیہہ نہیں بنتی۔ مخالفینِ مذہب نے کہا کہ اب اس مقصد کے لئے ہم کو خدائی مفروضے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ جدید سائنسی تحقیقات کی روشنی میں ہم آسانی کے ساتھ پوری کائنات کی اس طرح تشریح کرسکتے ہیں کہ کسی بھی مرحلے میں خدا کو ماننے کی کوئی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ اس طرح خدا کا خیال ان کی نظر میں ایک بے ضرورت چیز بن گیا اور جو خیال بے ضرورت ہو جائے اس کا بے بنیاد ہونا لازمی ہے۔

یہ دعویٰ جب کیا گیا، اس وقت بھی اگرچہ وہ علمی حیثیت سے نہایت کمزور تھا۔ مگر اب تو خود سائنس نے براہِ راست یا بالواسطہ طور پر اس بات کا اعتراف کر لیا ہے کہ اس کے پاس اس قسم کا دعویٰ کرنے کے لئے اطمینان بخش دلائل موجود نہیں ہیں۔

سائنس کی وہ کیا دریافت تھی جس میں لوگوں کو نظر آیا کہ اب خدا کی ضرورت ختم ہوگئی ہے۔ وہ خاص طور پر یہ تھا کہ سائنس نے معلوم کیا کہ کائنات کچھ خاص قوانینِ فطرت کی تابع ہے۔

قدیم زمانے کا انسان سادہ طور پر یہ سمجھتا تھا کہ دنیا میں جو کچھ ہورہا ہے اس کا کرنے والا خدا ہے۔ مگر جدید ذرائع اور جدید طرز تحقیق کی روشنی میں دیکھا گیا تو معلوم ہوا کہ ہر واقعہ کے پیچھے ایک ایسا سبب موجود ہے جس کو تجربہ کر کے معلوم کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً نیوٹن کے مشاہدے میں نظر آیا کہ آسمان کے تمام ستارے اور سیارے کچھ ناقابل تغیر قوانین میں بندھے ہوئے ہیں اور انھیں کے تحت حرکت کرتے ہیں۔ ڈارون کی تحقیق نے اسے بتایا کہ انسان کسی خاص تخلیقی حکم کے تحت وجود میں نہیں آیا بلکہ ابتدائی زمانے کے کیڑے مکوڑے عام مادی قوانین کے تحت ترقی کرتے کرتے انسان بن گئے ہیں۔ اس طرح مطالعہ اور تجربے کے بعد زمین سے لے کر آسمان تک سارے واقعات ایک معلوم نظام کے تحت ظاہر ہوتے ہوئے نظر آئے۔ جس کو قانون فطرت (Law of Nature) کا نام دیا گیا۔ قانون فطرت کا یہ عمل اس درجہ موثر تھا کہ اس کے بارے میں پیشگی خبر دی جاسکتی تھی۔

اس دریافت کا مطلب یہ تھا کہ جس کائنات کو ہم سمجھتے تھے کہ وہاں خدا کی کارفرمائی ہے، وہ کچھ مادی اور طبیعیاتی قوانین کی کارفرمائیوں کے تابع تھی۔ جب ان قوانین کو استعمال کیا گیا اور اس کے کچھ نتائج بھی برآمد ہوئے تو انسان کا یقین اور زیادہ بڑھ گیا۔ جرمن فلسفی کانٹ نے کہا ـــــ " مجھے مادہ مہیا کرو اور میں تم کو بتا دوں گا کہ دنیا اس مادے سے کس طرح بنائی جاتی ہے "۔ ہیکل (Haekel) نے دعویٰ کیا کہ " پانی، کیمیاوی اجزاء اور وقت ملے تو وہ ایک انسان کی تخلیق کرسکتا ہے۔ نٹشے نے اعلان کر دیا کہ " اب خدا مر چکا ہے "۔ اس طرح یہ یقین کر لیا گیا کہ اس کائنات کا خالق اور مالک کوئی زندہ اور صاحب ذہن وارادہ ہستی نہیں ہے بلکہ کائنات از اول تا آخر ایک مادی کائنات ہے۔ کائنات کی ساری حرکتیں اور اس کے تمام مظاہر خواہ وہ ذی روح اشیاء سے متعلق ہوں یا بے روح اشیاء کے بارے میں ہوں، اندھے مادی عمل کے سوا اور کچھ نہیں۔ سائنس نے جس دنیا کو دریافت کیا اس میں کہیں اس خدا کی کارفرمائی نظر نہیں آتی تھی جو تمام مذاہب کی بنیاد ہے۔ پھر خدا کو مانا جائے تو کس لئے مانا جائے۔

اگرچہ اس دریافت کے ابتدائی تمام ہیرو خدا کو ماننے والے لوگ تھے۔ مگر دوسرے لوگوں کے سامنے جب یہ تحقیق آئی تو انہوں نے پایا کہ اس دریافت نے سرے سے خدا کے وجود ہی کو بے معنی ثابت کر دیا ہے۔ کیونکہ واقعات کی توجیہہ کے لئے جب خود مادی دنیا کے اندر اسباب و قوانین مل رہے ہوں تو پھر اس کے لئے مادی دنیا سے باہر ایک خدا کو فرض کرنے کی کیا ضرورت۔

انہوں نے کہا کہ جب تک دوربین نہیں بنی تھی اور ریاضیات نے ترقی نہیں کی تھی اس وقت انسان نہیں جان سکتا تھا کہ سورج کیسے نکلتا ہے اور کیسے ڈوبتا ہے۔ چنانچہ اپنی لاعلمی کی وجہ سے اس نے یہ فرض کر لیا کہ کوئی خدائی طاقت ہے جو ایسا کرتی ہے۔ مگر اب فلکیات کے مطالعہ سے ثابت ہو گیا ہے کہ جذب و کشش کا ایک عالمی نظام ہے جس کے تحت سورج، چاند اور تمام ستارے اور سیارے حرکت کر رہے ہیں۔ اس لئے اب خدا کو ماننے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اسی طرح وہ تمام چیزیں جن کے متعلق پہلے سمجھا جاتا تھا کہ ان کے پیچھے کوئی ان دیکھی طاقت کام کر رہی ہے، وہ سب جدید مطالعہ کے بعد ہماری جانی پہچانی فطری طاقتوں کے عمل اور ردعمل کا نتیجہ نظر آئیں۔ گویا واقعہ کے فطری اسباب معلوم ہونے کے بعد وہ ضرورت آپ سے آپ ختم ہو گئی جس کے لئے پچھلے لوگوں نے ایک خدا یا مافوق الفطری طاقت کا وجود فرض کر لیا تھا۔ "اگر قوس قزح گرتی ہوئی بارش پر سورج کی شعاعوں کے انعطاف (Refraction) سے پیدا ہوتی ہے تو یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ وہ آسمان کے اوپر خدا کا نشان ہے"۔ ہکسلے اس قسم کے واقعات پیش کرتا ہوا کس قدر یقین کے ساتھ کہتا ہے:

If events are due to natural causes,
they are not due to supernatural causes.

یعنی واقعات اگر فطری اسباب کے تحت صادر ہوتے ہیں تو وہ مافوق الفطری اسباب کے پیدا کئے ہوئے نہیں ہو سکتے۔ اور ظاہر ہے کہ جب واقعات کے پیچھے مافوق الفطری اسباب موجود نہ ہوں تو کسی مافوق الفطرت ہستی کے وجود پر کیسے یقین کیا جا سکتا ہے۔

مخالفین مذہب کے اس استدلال میں کیا کمزوری ہے، اس کو ایک مثال سے سمجھئے۔ ایک شخص ریلوے انجن کو دیکھتا ہے کہ اس کے پہیے گھوم رہے ہیں اور وہ پٹری پر بھاگا چلا

جارہا ہے ۔ اس کے ذہن میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ پہیے کیسے گھوم رہے ہیں ۔تحقیق کرنے کے بعد اس کی رسائی انجن کے پرزوں تک ہوتی ہے ۔ وہ دیکھتا ہے کہ پرزوں کی حرکت سے پہیے گھوم رہے ہیں ۔ کیا اس دریافت کے بعد وہ یہ سمجھنے میں حق بجانب ہوگا کہ انجن اپنے پرزوں کے ساتھ بذات خود ٹرین کی حرکت کا سبب ہے ۔ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے ۔ انجن سے پہلے انجینیر اور ڈرائیور کو ماننا ضروری ہے ۔ انجینیر اور ڈرائیور کے بغیر انجن کا نہ تو کوئی وجود ہے اور نہ اس میں کسی قسم کی حرکت کا تصور کیا جا سکتا ہے ۔ گویا انجن یا اس کا پرزہ آخری حقیقت نہیں ۔ آخری حقیقت وہ ذہن ہے جو انجن کو وجود میں لایا ہے ' اور اپنے ارادہ سے اس کو چلا رہا ہے ۔

ایک مغربی عیسائی عالم نے بہت صحیح کہا کہ فطرت کائنات کی توجیہ نہیں کرتی ' وہ خود اپنے لئے ایک توجیہ کی طالب ہے ۔

Nature does not explain,
she is herself in need of an explanation.

کیونکہ "اس کے الفاظ میں ' فطرت کا قانون تو کائنات کا ایک واقعہ ہے ' اس کو کائنات کی توجیہ نہیں کہا جا سکتا ۔

Nature is a fact, not an explanation.

مرغی کا بچہ انڈے کے مضبوط خول کے اندر پرورش پاتا ہے اور اس کے ٹوٹنے سے باہر آجاتا ہے ۔ یہ واقعہ کیوں کر ہوتا ہے کہ خول ٹوٹے اور بچہ جو گوشت کے لوتھڑے سے زیادہ نہیں ہوتا ' وہ باہر نکل آئے ۔ پہلے کا انسان اس کا جواب یہ دیتا تھا کہ ــــ "خدا ایسا کرتا ہے" مگر اب خوردبینی مشاہدے کے بعد معلوم ہوا کہ جب ۲۱ روز کی مدت پوری ہونے والی ہوتی ہے ' اس وقت انڈے کے اندر ننھے بچے کی چونچ پر ایک چھوٹی سی سخت سینگ ظاہر ہوتی ہے ۔ اس کی مدد سے وہ اپنے خول کو توڑ کر باہر آجاتا ہے ۔ سینگ اپنا کام پورا کرکے بچے کی پیدائش کے چند دن بعد خود بخود جھڑ جاتی ہے ۔

مخالفین مذہب کے نظرئے کے مطابق یہ مشاہدہ اس پرانے خیال کو غلط ثابت کر دیتا ہے کہ بچہ کو باہر نکالنے والا خدا ہے ۔ کیونکہ خوردبین کی آنکھ ہم کو صاف طور پر دکھا رہی ہے کہ ۲۱ روزہ قانون ہے جس کے تحت وہ صورتیں پیدا ہوتی ہیں جو بچہ کو خول کے باہر لاتی ہیں

مگر یہ مغالطہ کے سوا اور کچھ نہیں ۔ جدید مشاہدہ نے جو کچھ ہمیں بتایا ہے وہ صرف واقعہ کی چند مزید کڑیاں ہیں ۔ اس نے واقعہ کا اصلی اور آخری سبب نہیں بتایا ۔ اس مشاہدہ کے بعد صورت حال میں جو فرق ہوا ہے وہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ پہلے جو سوال خول ٹوٹنے کے بارے میں تھا، وہ "سینگ" کے اوپر جاکر ٹھہر گیا ۔ بچہ کا اپنی سینگ سے خول کا توڑنا، واقعہ کی صرف ایک درمیانی کڑی ہے ۔ اس لحاظ سے وہ اصل واقعہ ہی کا ایک جزء ہے، وہ واقعہ کی تشریح نہیں ہے ۔ واقعہ کی تشریح تو اس وقت معلوم ہوگی جب ہم جان لیں کہ وہ آخری اسباب کیا ہیں جن کے نتیجے میں بچہ کی چونچ پر سینگ نمودار ہوئی ۔ اس آخری سبب کو جاننے سے پہلے سینگ کا ظہور خود ایک سوال ہے، نہ کہ اسے اصل سوال کا جواب قرار دیا جائے ۔ کیونکہ پہلے اگر یہ سوال تھا کہ "خول کیسے ٹوٹتا ہے" تو اب یہ سوال ہوگیا کہ "سینگ کیسے بنتی ہے ؟" ظاہر ہے کہ دونوں حالتوں میں کوئی نوعی فرق نہیں ۔ اس کو زیادہ سے زیادہ فطرت کا وسیع تر مشاہدہ کہہ سکتے ہیں ۔ فطرت کی توجیہ کا نام نہیں دے سکتے ۔

مخالفین مذہب جس انکشاف کو فطرت کی توجیہ کا نام دے کر اس کو خدا کا بدل ٹھہرا رہے ہیں اس کو ہم نہایت آسانی سے فطرت کا طریق کار کہہ سکتے ہیں ۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ خدا ان قوانین کے ذریعہ کائنات میں اپنا عمل کرتا ہے ۔ جس کے بعض اجزاء کو سائنس نے دریافت کیا ہے ۔ فرض کیجیے، مذہبی لوگ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ سمندروں میں جوار بھاٹا لانے والا خدا ہے ۔ اب جدید دور کا ایک سائنس داں اٹھتا ہے اور ہم کو بتاتا ہے کہ جوار بھاٹا درحقیقت چاند کی کشش (Gravity-pull of the moon) اور دنیا کے سمندروں اور خشکی کے ٹکڑوں کی جغرافی وضع و ہیئت (Geographical Configuration) کے سبب سے ہوتا ہے ۔ سائنس داں کے اس مشاہدے کو ہمیں رد کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ۔ بہت خوشی کے ساتھ ہم اسے قبول کر سکتے ہیں ۔ مگر اس سے ہمارے عقیدے کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا ۔ یہ صحیح ہے کہ طوفان، قوت کشش اور زمین کی جغرافی بناوٹ کے ذریعہ عمل کرتا ہے ۔ مگر قوت کشش اور جغرافی بناوٹ کیا ہیں ۔ وہ بھی خدا ہی کی مخلوق ہیں ۔ وہ خدا ہی ہے جو ان ذرائع سے اپنا فعل انجام دیتا ہے ۔ خدا آج بھی طوفان کا حقیقی سبب ہے ۔ جان ولسن کے الفاظ ہیں :

This does'nt destroy my belief: it is still God, working through these things, who is responsible for the tides.

Philosophy and Religion, John Wilson, London 1961, p. 36

اسی طرح حیاتیات کے میدان میں نظریۂ ارتقاء کے حوالے سے یہ بات بار بار دہرائی گئی ہے کہ حیاتیاتی عمل اب کسی ماورائے فطرت ذریعہ کی موجودگی کا تقاضا نہیں کرتا۔ دوسرے لفظوں میں زندگی کے مسئلے کو سمجھنے کے لئے کسی باشعور خدا کو ماننے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ جدید مطالعہ یہ ثابت کرتا ہے کہ زندگی صرف چند مادی طاقتوں سے خود بخود حاصل ہونے والا ایک نتیجہ ہے جو خاص طور پر تین ہیں:

Reproduction, variation and differential survival.

یعنی توالدوتناسل کے ذریعہ مزید زندگیوں کا پیدا ہونا، پیدا شدہ نسل کے بعض افراد میں کچھ فرقوں کا ظہور اور پھر ان فروق کا پشت ہا پشت میں ترقی کرکے مکمل ہوجانا۔۔۔۔ اس طرح مخالفین مذہب کے نقطہ نظر کے مطابق، ڈارون کے انتخاب طبیعی کے اصول کا حیاتیاتی مظاہر پر انطباق اس کو ممکن اور ضروری بنا دیتا ہے کہ زندگی کی نشوونما پر خدا کی کارفرمائی کے تصور کو بالکل ترک کردیا جائے۔

اگرچہ ابھی تک بذات خود یہ بات غیر ثابت شدہ ہے کہ انواع حیات فی الواقع اسی طرح وجود میں آئی ہیں جیسا کہ ارتقاء پسند علماء بتاتے ہیں۔ تاہم اگر اس کو بلا بحث مان لیا جائے جب بھی اس سے مذہبی عقیدے کے تزلزل کا سوال پیدا نہیں ہوتا کیونکہ انواع حیات اگر بالفرض ارتقائی عمل کے تحت وجود میں آئی ہوں، جب بھی یکساں درجہ کی قوت کے ساتھ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ یہ خدائی تخلیق کا طریقہ ہے، نہ کہ اندھے مادی عمل کا خود بخود نتیجہ۔ حقیقت یہ ہے کہ مشینی ارتقاء (Mechanical evolution) کو نہایت آسانی کے ساتھ تخلیقی ارتقاء (Creational Evolution) ثابت کیا جاسکتا ہے۔ اور سائنس کے حوالے سے مذہب کی مخالفت کرنے والوں کے پاس اس کی تردید کی کوئی واقعی بنیاد نہیں ہوگی۔ کیونکہ جو چیز مشاہدہ میں آئی ہے وہ ارتقاء ہے نہ کہ اس کی مشینیت۔

مگر بات صرف اتنی ہی نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سائنس نے بیسویں صدی میں پہنچ کر اپنے سابقہ یقین کو کھو دیا ہے۔ آج جبکہ نیوٹن کی جگہ آئن سٹائن نے لے لی ہے اور پلانک اور ہیزن برگ نے لاپلاس کے نظریات کو منسوخ کردیا ہے، اب مخالفین مذہب کے لئے کم از کم علمی بنیاد پر، اس قسم کا دعویٰ کرنے کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ نظریہ اضافیت (Relativity) اور کوانٹم تھیوری نے خود سائنس دانوں کو اس نتیجہ تک پہنچایا ہے کہ وہ

اس بات کا اعتراف کرلیں کہ یہ ناممکن ہے کہ سائنس میں مشاہد (Observer) کو مشاہدہ سے الگ کیا جاسکے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم کسی چیز کے صرف چند خارجی مظاہر کو دیکھ سکتے ہیں، اس کی اصل حقیقت کا مشاہدہ نہیں کرسکتے۔ بیسویں صدی میں سائنس کے اندر جو انقلاب ہوا ہے اس نے خود سائنسی نقطۂ نظر سے مذہب کی اہمیت ثابت کردی ہے۔

سائنس میں جو چیز جدید انقلاب کہی جاتی ہے، وہ اس واقعہ پر مشتمل ہے کہ نیوٹن کا نظریہ دوسو سال تک سائنس کی دنیا پر حکمراں رہا، وہ اب جدید مطالعہ کے بعد ناقص پایا گیا ہے۔ اگرچہ سابقہ فکر کی جگہ ابھی تک کوئی مکمل نظریہ نہیں آسکا ہے مگر یہ واضح ہے کہ نئے رجحان کے فلسفیانہ تقاضے اس سے بالکل مختلف ہیں جو پچھلے نظریے کے تھے۔ اب یہ دعوی نہیں رہا کہ سائنٹفک طریق مطالعہ ہی حقیقت کو معلوم کرنے کا واحد صحیح طریقہ ہے۔ سائنس کے ممتاز علمار حیرت انگیز طور پر اصرار کررہے ہیں کہ:

Science gives us but a partial knowledge of reality.

سائنس ہم کو صداقت کا صرف جزئی علم دیتی ہے۔

سائنسی رجحان میں یہ تبدیلی اچانک پیدا ہوئی ہے۔ بمشکل سو برس گزرے ہیں جب کہ ٹنڈل (Tyndall) نے اپنے خطبۂ بلفاسٹ (Belfast Address) میں اعلان کیا تھا کہ سائنس تنہا انسان کے تمام اہم معاملات سے بحث (Deal) کرنے کے لئے کافی ہے۔ اس قسم کے خیالات اس مفروضہ یقین کی بنیاد پر قائم کئے گئے تھے کہ حقیقت تمام کی تمام صرف مادہ اور حرکت (Matter and Motion) پر مشتمل ہے۔ مگر فطرت کو مادہ اور حرکت کی اصطلاحوں میں بیان کرنے کی ساری کوشش ناکام ثابت ہوئی۔ اٹھارہویں صدی کے آخر میں یہ کوشش اپنے عروج پر تھی جب لاپلاس (Laplace) نے یہ کہنے کی جرأت کی کہ ایک عظیم ریاضی داں جو ابتدائی سحابیہ (Nebula) میں ذرات کے انتشار کو جانتا ہو، وہ دنیا کے مستقبل کی پوری تاریخ کو پیشگی بتاسکتا تھا۔ اس وقت یہ یقین کرلیا گیا تھا کہ نیوٹن کا نظریہ سارے علوم کی کنجی ہے۔ اس کے بعد کسی اور چیز کی ضرورت نہیں۔

نیوٹن کے نظریے کی غلطی پہلی بار اس وقت ظاہر ہوئی جب علمار نے روشنی کی مادی تشریح کرنے کی کوشش کی۔ یہ کوشش انھیں ایتھر (Ether) کے عقیدے تک لے گئی جو بالکل مجہول اور ناقابل بیان عنصر تھا۔ کچھ نسلوں تک یہ عجیب وغریب عقیدہ چلتا رہا۔ روشنی کی مادی

تعبیر کے حق میں ریاضیات کے خوب خوب معجزے دکھائے گئے۔ لیکن میکسویل (Maxwell) کے تجربات کی اشاعت کے بعد یہ مشکل نا قابل عبور نظر آنے لگی۔ کیونکہ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ روشنی ایک برقی مقناطیسی مظہر (Electromagnetic Phenomenon) ہے۔ یہ غلا بڑھتا رھا۔ یہاں تک کہ وہ دن آیا جب علمائے سائنس پر واضح ہوا کہ نیوٹن کے نظریات میں کوئی چیز مقدس نہیں ہے۔ بہت دنوں کے تذبذب اور بجلی کو مادی (Mechanical) ثابت کرنے کی آخری کوششوں کے بعد بالآخر بجلی کو نا قابل تحویل عناصر (Irreducible Elements) کی فہرست میں شامل کر دیا گیا۔

یہ بظاہر ایک سادہ سی بات ہے۔ مگر درحقیقت یہ بہت معنی خیز فیصلہ ہے۔ نیوٹن کے تصور میں ہم کو سب کچھ اچھی طرح معلوم تھا۔ اس کے مطابق ایک جسم کی کمیت اس کی مقدار مادہ تھی، طاقت کا مسئلہ حرکت سے سمجھ میں آجاتا تھا، وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح یقین کر لیا گیا تھا کہ ہم اس فطرت کو جانتے ہیں جس کے متعلق ہم کلام کر رہے ہیں۔ مگر بجلی کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ اس کی فطرت (Nature) ایسی ہے جس کے متعلق ہم کچھ نہیں جان سکتے۔ اس کو معلوم اصطلاحوں میں تعبیر کرنے کی ساری کوششیں ناکام ہوگئیں۔ وہ سب کچھ جو ہم بجلی کے متعلق جانتے ہیں وہ صرف وہ طریقہ ہے جس سے وہ ہمارے پیمائشی آلات کو متاثر کرتی ہے ——

اب ہم سمجھ سکتے ہیں کہ یہ بات کس قدر اہم ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک ایسے وجود (Entity) کو طبیعیات میں تسلیم کر لیا گیا جس کے متعلق ہم اس کے ریاضیاتی ڈھانچے کے سوا اور کچھ نہیں جانتے۔

اس کے بعد اس نہج پر اس قسم کے اور بھی وجود تسلیم کئے گئے۔ اور یہ مان لیا گیا کہ یہ لامعلوم ہستیاں بھی سائنسی نظریات کے بنانے میں وہی حصہ ادا کرتی ہیں جو قدیم معلوم مادہ ادا کرتا تھا۔ یہ حقیقت قرار پا گیا کہ جہاں تک علم طبیعیات کا تعلق ہے، ہم کسی چیز کے اصلی وجود کو نہیں جان سکتے۔ بلکہ صرف اس کے ریاضیاتی ڈھانچے (Mathematical Structure) کو جاننے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ اب اعلیٰ ترین سطح پر یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ ہمارا یہ خیال کہ ہم اشیاء کو ان کی آخری صورت میں دیکھ سکتے ہیں، محض فریب تھا۔ نہ صرف یہ کہ ہم نے دیکھا نہیں ہے بلکہ ہم اسے دیکھ بھی نہیں سکتے۔

پروفیسر اڈنگٹن (Eddington) کے نزدیک ریاضیاتی ڈھانچہ کا علم ہی وہ واحد علم ہے جو

طبیعیاتی سائنس ہمیں دے سکتی ہے۔

" جمالیاتی، اخلاقی، اور روحانی پہلوؤں سے قطع نظر، کمیت مادہ، جوہر، وسعت اور مدت وغیرہ، جو خالص طبیعیات کے دائرے کی چیزیں سمجھی جاتی ہیں، ان کی کیفیت کو جاننا بھی ہمارے لئے ویسا ہی مشکل ہوگیا ہے جیسے غیر مادی چیزوں کی حقیقت کو جاننا۔ موجودہ طبیعیات اس پوزیشن میں نہیں ہے کہ وہ ان چیزوں سے براہ راست واقف ہوسکے۔ ان کی حقیقت ادراک سے باہر ہے۔ ہم ذہنی خاکوں کی مدد سے اندازہ کرتے ہیں۔ مگر ذہن کا کوئی عکس ایک ایسی چیز کی بعینہ نقل نہیں ہوسکتا جو خود ذہن کے اندر موجود نہ ہو۔ اس طرح اپنے حقیقی طریق مطالعہ کے اعتبار سے طبیعیات ان خارج از ادراک خصوصیتوں کا مطالعہ نہیں کرتی بلکہ وہ صرف مطالعہ برآلہ (Pointer-reading) ہے جو ہمارے علم میں آتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ یہ مطالعہ عمل کائنات کی بعض خصوصیات کو منعکس کرتا ہے، مگر ہماری اصل معلومات آلاتی مطالعہ سے متعلق ہیں نہ کہ وہ خصوصیات کے بارے میں ہیں۔ آلاتی مطالعہ کو اشیاء کی حقیقی خصوصیات سے وہی نسبت ہے جو ٹیلی فون نمبر کو اس شخص سے جس کا وہ فون نمبر ہے۔"[۱]

یہ واقعہ کہ سائنس صرف ڈھانچہ کی معلومات تک محدود ہے، بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ حقیقت ابھی پورے طور پر معلوم شدہ نہیں ہے۔ اب یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ہمارے احساسات یا خدا سے اتصال کا عارفانہ تجربہ اپنا کوئی خارجی جواب (Objective Counterpart) نہیں رکھتا۔ یہ قطعی ممکن ہے کہ ایسا کوئی جواب خارج میں موجود ہو۔ ہمارے مذہبی اور جمالیاتی احساسات اب محض مظاہر فریب (Illusory Phenomenon) نہیں کہے جاسکتے جیسا کہ پہلے سمجھا جاتا تھا۔ نئی سائنسی دنیا میں مذہبی عارف بھی ایک حقیقت کے طور پر رہ سکتا ہے۔

The Limitations of Science. p. 138-42

سائنٹفک فلاسفہ نے اس قسم کی تشریحات شروع کردی ہیں مارٹن وائٹ (Morton White) کے الفاظ میں —— بیسویں صدی میں فلسفیانہ ذہن رکھنے والے سائنس دانوں نے ایک نئی جنگ (Crusade) کا آغاز کردیا ہے۔ جس میں وہائٹ ہیڈ، ایڈنگٹن اور جینز کے

۱؎ *The Domain of Physical Science—Essay in Science Religion and Reality.*

نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔[1] ان علماء کا فکر صریح طور پر کائنات کی مادی تعبیر کی نفی کرتا ہے۔ مگر ان کی اصل خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے خود جدید طبیعیات اور ریاضیات کے نتائج کے حوالے سے اپنا نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کے بارے میں وہی الفاظ صحیح ہیں جو مارٹن وائٹ نے وائٹ ہیڈ کے متعلق لکھے ہیں:

He is a heroic thinker who tries to beard the lions of Intel-letualism, Materialism and positivism in their own bristling den.

یعنی وہ ایک بلند ہمت مفکر ہے جس نے مادہ پرستی کے شیروں کو عین ان کے بھٹ میں للکارا ہے۔

انگریز ماہر ریاضیات اور فلسفی الفرڈ ارتھ وائٹ ہیڈ (۱۸۶۱-۱۹۴۷) کے نزدیک جدید معلومات یہ ثابت کرتی ہیں کہ:

Nature is Alive p. 84

یعنی فطرت بے روح مادہ نہیں، بلکہ زندہ فطرت ہے۔

انگریز ماہر فلکیات سر آرتھر اڈنگٹن (۱۸۸۲-۱۹۴۴) نے موجودہ سائنس کے مطالعہ سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ:

The stuff of the world is mind-stuff. p. 146

یعنی کائنات کا مادہ ایک شئے ذہنی ہے۔

ریاضیاتی طبیعیات کا انگریز عالم سر جیمز جینز (۱۸۷۷-۱۹۴۶) جدید تحقیقات کی تعبیر ان الفاظ میں کرتا ہے:

The universe is a universe of thought. p. 134

یعنی کائنات، مادی کائنات نہیں بلکہ تصوراتی کائنات ہے۔

یہ انتہائی مستند سائنس دانوں کے خیالات ہیں جن کا خلاصہ جے۔ ڈبلیو۔ این سولیون کے الفاظ میں یہ ہے کہ:

The ultimate nature of the universe is mental p. 145

---

[1] *The Age of Analysis*, p. 84

کائنات کی آخری ماہیت ذہن ہے ۔ [1]

یہ ایک عظیم تبدیلی ہے جو پچھلی نصف صدی کے دوران میں سائنس کے اندر ہوئی ہے۔ اس تبدیلی کا اہم ترین پہلو، جے ۔ ڈبلیو ۔ این سولیون کے الفاظ میں' یہ نہیں ہے کہ تمدنی ترقی کے لئے زیادہ طاقت حاصل ہوگئی ہے ۔ بلکہ یہ تبدیلی وہ ہے جو اس کی مابعدالطبیعیاتی بنیادوں (Metaphysical Foundation) میں واقع ہوئی ہے ۔

The Limitations of Science, p. 138-50

برطانیہ کے مشہور ماہر فلکیات اور ریاضی داں سر جیمز جینز (Sir James Jeans) کی کتاب "پراسرار کائنات" غالباً اس پہلو سے موجودہ زمانے کا سب سے زیادہ قیمتی مواد ہے ۔ اس کتاب میں موصوف خالص سائنسی بحث کے ذریعہ اس نتیجے تک پہنچتے ہیں کہ :

" جدید طبیعیات کی روشنی میں کائنات مادی تشریح (Material Representation) کو قبول نہیں کرتی ۔ اور اس کی وجہ میرے نزدیک یہ ہے کہ اب وہ محض ایک ذہنی تصور (Mental Concept) ہو کر رہ گئی ہے ۔"

The Mysterious Universe. (1948) p. 123

---

[1] آخری حقیقت ذہن ہے یا مادہ ۔ یہ فلسفیانہ الفاظ میں دراصل یہ سوال ہے کہ کائنات محض مادہ کے ذاتی عمل کے طور پر خود بخود بن گئی ہے یا کوئی غیر مادی ہستی ہے جس نے بالارادہ اسے تخلیق کیا ہے ۔ جیسے کسی مشین کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ اپنے آخری تجزیے میں محض لوہے اور پٹرول کا ایک اتفاقی مرکب ہے ۔ گویا یہ کہنا ہے کہ مشین سے پہلے صرف لوہا اور پٹرول تھا اور اس نے خود ہی کسی اندھے عمل کے ذریعہ محض اتفاق سے مشین کی صورت اختیار کرلی ہے ۔ اس کے برعکس اگر یہ کہا جائے کہ مشین اپنے آخری تجزیے میں انجینئر کا ذہن ہے، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ مشین سے پہلے ایک ذہن تھا جس نے مادہ سے الگ اس کے ڈزائن کو سوچا اور پھر اپنے ارادہ کے تحت اسے تیار کیا ۔

"ذہن" کے تعین میں اختلاف سے ذہن کو آخری حقیقت ماننے والوں میں مختلف گروہ ہو سکتے ہیں ۔ جیسے خدا کو ماننے والے خدا کو ماننے کے باوجود مختلف ٹولیوں کی شکل میں پائے جاتے ہیں ۔ مگر علمی مطالعہ کا یہ نتیجہ کہ کائنات کی آخری حقیقت ذہن ہے، یہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے مذہب کی تصدیق ہے اور الحاد کی تردید ۔

جینز کے الفاظ میں :

If the universe is a universe of thought, then its creation must have been an act of thought. p. 133-34

یعنی جب کائنات ایک تصوراتی کائنات ہے تو اس کی تخلیق بھی ایک تصوراتی عمل سے ہونی چاہیئے ۔ وہ کہتا ہے کہ مادہ کو امواج برق سے تعبیر کرنے کا جدید نظریہ انسانی تخیل کے لئے بالکل ناقابل ادراک ہے چنانچہ کہا جاتا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ یہ لہریں محض امکان کی لہریں (Waves of Probabilities) ہوں جن کا کوئی وجود نہ ہو ـــــ یہ اور اس طرح کے دوسرے وجوہ سے سرجیمز جینز اس نتیجہ تک پہنچا ہے کہ کائنات کی حقیقت مادہ نہیں، بلکہ تصور ہے ۔ یہ تصور کہاں واقع ہے ۔ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ ایک عظیم کائناتی ریاضی داں (Mathematical Thinker) کے ذہن میں ہے ۔ کیونکہ اس کا ڈھانچہ، جو ہمارے علم میں آتا ہے، وہ مکمل طور پر ریاضیاتی ڈھانچہ ہے ۔ یہاں میں اس کا ایک اقتباس نقل کروں گا :

"یہ کہنا صحیح ہوگا کہ علم کا دریا پچھلے چند سالوں میں ایک نئے رخ پر مڑا ہے ۔ تیس سال[1] پہلے ہم نے یہ سمجھ لیا تھا کہ ہم ایک ایسی حقیقت کے سامنے ہیں جو اپنی نوعیت میں مشینی (Mechanical) قسم کی ہے ۔ ایسا نظر آتا تھا کہ کائنات ایٹموں کے ایک ایسے بے ترتیب انبار پر مشتمل ہے جو اتفاقی طور پر اکھٹا ہوگئے ہیں اور جن کا کام یہ ہے کہ بے مقصد اور اندھی طاقتوں کے عمل کے تحت، جو کوئی شعور نہیں رکھتیں، کچھ زمانے کے لئے بے معنی رقص کریں جس کے ختم ہونے پر محض ایک مردہ کائنات باقی رہ جائے ۔ اس خالص میکانکی دنیا میں، مذکورہ بالا اندھی طاقتوں کے عمل کے دوران میں، زندگی محض اتفاق سے وجود میں آگئی ۔ کائنات کا ایک بہت ہی چھوٹا گوشہ یا امکان کے طور پر اس طرح کے کئی گوشے کچھ عرصے کے لئے اتفاقی طور پر ذی شعور ہوگئے ہیں اور یہ بھی ایک بے روح دنیا کو چھوڑ کر بالآخر ایک روز ختم ہوجائیں گے ۔ آج ایسے قوی دلائل موجود ہیں جو طبیعی سائنس کو یہ ماننے پر مجبور کرتے ہیں کہ علم کا دریا ایک غیر مشینی حقیقت (Non-Mechanical Reality) کی طرف چلا جا رہا ہے ۔ کائنات ایک بہت بڑی مشین کے بجائے ایک بہت بڑے خیال (Great Thought) سے زیادہ مشابہ معلوم

---

[1] یہ کتاب پہلی بار ۱۹۳۰ء میں شائع ہوئی ۔

ہوتی ہے۔ ذہن (Mind) اتفاقاً محض اجنبی کی حیثیت سے اس مادی دنیا میں وارد نہیں ہوگیا ہے۔ اب ہم ایک ایسے مقام پر پہنچ رہے ہیں کہ ذہن کا عالم مادی کے خالق اور حکمراں کی حیثیت سے استقبال کریں۔ یہ ذہن بلاشبہ ہمارے شخصی ذہن کی طرح نہیں ہے۔ بلکہ ایک ایسا ذہن ہے جس نے مادی ایٹم سے انسانی دماغ کی تخلیق کی۔ اور یہ سب کچھ ایک اسکیم کی شکل میں پہلے سے اس کے ذہن میں موجود تھا — جدید علم ہم کو مجبور کرتا ہے کہ ہم دنیا کے بارے میں اپنے ان خیالات پر نظر ثانی کریں جو ہم نے جلدی میں قائم کر لئے تھے .... ہم نے دریافت کر لیا ہے کہ کائنات ایک منصوبہ ساز یا حکمراں (Designing or Controlling Power) کی شہادت دے رہی ہے جو ہمارے شخصی ذہن سے بہت کچھ مشابہ ہے۔ جذبات و احساسات کے اعتبار سے نہیں بلکہ اس طرز پر سوچنے کے اعتبار سے جس کو ہم ریاضیاتی ذہن (Mathematical Mind) کے الفاظ میں ادا کر سکتے ہیں۔"

The Mysterious Universe, p. 136-38

سائنس کے اندر علمی حیثیت سے اس تبدیلی کے باوجود یہ واقعہ ہے کہ عملی طور پر انکار خدا کے ذہن میں کوئی نمایاں فرق پیدا نہیں ہوا ہے۔ بلکہ اس کے برعکس انکار خدا کے وکیل نئے نئے ڈھنگ سے اپنے دلائل کو ترتیب دینے میں لگے ہوئے ہیں۔ اس کی وجہ کوئی علمی دریافت نہیں بلکہ محض تعصب ہے۔ تاریخ بے شمار مثالوں سے بھری ہوئی ہے کہ حقیقت کے ظاہر ہو جانے کے باوجود انسان نے محض اس لئے اس کو قبول نہیں کیا کہ تعصب اس کی اجازت نہیں دیتا تھا۔

یہی تعصب تھا جب چار سو برس پہلے اٹلی کے علماء نے ارسطو کے مقابلے میں گلیلیو کے نظرئے کو ماننے سے انکار کر دیا۔ حالانکہ لیننگ ٹاور سے گرنے والے گولے اس کے نظرئے کو آنکھوں دیکھی حقیقت بنا چکے تھے۔ پھر یہی تعصب تھا کہ جب انیسویں صدی کے آخر میں برلن کے پروفیسر ماکس پلانگ (Max Planck) نے روشنی کے متعلق بعض ایسی تشریحات پیش کیں جو کائنات کے نیوٹنی تصور کو غلط ثابت کر رہی تھیں تو وقت کے ماہرین نے اس کو تسلیم نہیں کیا اور عرصہ تک اس کا مذاق اڑاتے رہے۔ حالانکہ آج وہ کوانٹم تھیوری کی صورت میں علم طبیعیات کے اہم اصولوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

اگر کسی کا یہ خیال ہو کہ تعصب دوسرے لوگوں میں تو ہو سکتا ہے، مگر سائنس دانوں میں

نہیں ہوتا۔ تو اس کو میں ایک سائنس داں کا قول یاد دلاؤں گا۔ ڈاکٹر ہلز (A.V. Hills) نے کہا ہے:

I should be the last to claim that we, scientific men, are less liable to prejudice than other educated men.
Quoted by A.N. Gilkes, *Faith for Modern Man*. p. 109

یعنی میں آخری شخص ہوں گا جو اس بات کا دعوی کرے کہ ہم سائنس داں دوسرے تعلیم یافتہ لوگوں کے مقابلے میں کم تعصب رکھنے والے ہوتے ہیں۔

یہ بٹن دبانے کا معاملہ نہیں

ہم ایک ایسی دنیا میں ہیں جہاں تعصب کی کارفرمائی ہے۔ جہاں کسی بات کو قبول کرنے کے لئے طرح طرح کے جذبات حائل ہو جاتے ہیں۔ پھر ایک ایسی دنیا میں کیوں کر یہ امید کی جاسکتی ہے کہ کوئی بات محض اس لئے قبول کرلی جائے گی کہ وہ دلیل سے ثابت ہوگئی ہے۔

تاریخ کا طویل تجربہ ہے کہ انسان کے رہنما اکثر اس کے جذبات رہے ہیں نہ کہ اس کی عقل۔ اگرچہ علمی اور منطقی طور پر عقل ہی کو بلند مقام دیا جاتا ہے۔ مگر عملاً زیادہ تر ایسا ہی ہوا ہے کہ عقل خود جذبات کی آلۂ کار بنتی رہی ہے۔ تاریخ میں بہت کم ایسا ہوا ہے کہ عقل جذبات کو اپنے قابو میں کرنے میں کامیاب ثابت ہوئی ہو۔

عقل اکثر جذبات کے زیر اثر کام کرنے لگتی ہے۔ عقل نے ہمیشہ جذبات کے حق میں دلائل تراشے ہیں اور اس طرح ایک جذباتی رویہ کو عقلی رویہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتی رہی ہے۔ خواہ حقیقت واقعہ کا ساتھ نہ دے رہی ہو مگر انسان کی یہ کمزوری ہے کہ وہ اپنے جذباتی رویہ سے لپٹا رہنا اپنے لئے ضروری سمجھتا ہے۔

ہم کو یہ حقیقت یاد رکھنی چاہیے کہ ہمارا معاملہ کسی مشین سے نہیں ہے جس کو چلانے کے لئے اتنا کافی ہو کہ اس کا بٹن دبا دیا جائے۔ مشین ہمارے اندازہ کے عین مطابق اپنا ردعمل ظاہر کرتی ہے۔ ہمارا مخاطب انسان ہے۔ اور انسان کا حال یہ ہے کہ وہ اسی وقت کسی بات کو مانتا ہے جب کہ وہ خود بھی ماننا چاہے۔ اگر آدمی خود ماننا نہ چاہتا ہو تو کوئی دلیل محض دلیل ہونے کی حیثیت سے اس کو قائل نہیں کر سکتی۔ دلیل کو برقی بٹن کا قائم مقام نہیں بنایا جاسکتا۔ اور بلاشبہہ انسانی تاریخ کی یہ سب سے بڑی ٹریجڈی ہے۔

عقیدۂ خدا اور اسلام

یہاں میں یہ اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ عقیدۂ خدا کو صرف اصولی طور پر ثابت کر دینا کافی نہیں ہے۔ اسی کے ساتھ ایک عملی سوال بھی ہے۔ وہ یہ کہ خدا اگر ہے تو اس کے ساتھ ہمارا کیا تعلق ہے۔ انسان کے لئے خدا کو ماننے کی صحیح ترین صورت کیا ہے۔

یہاں ہمارے سامنے مختلف مذاہب آتے ہیں۔ اب کچھ لوگوں کی رائے یہ ہے تمام مذاہب سچے ہیں، اس لئے تم خواہ جس مذہب کے مطابق خدا کو مانو تمھاری نجات ہو جائے گی۔ اس میں شک نہیں کہ تمام مذاہب جو خدا کی طرف سے آئے وہ سب یکساں تھے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ آج وہ ہمارے سامنے یکساں حالت میں موجود نہیں۔ ایک اور دوسرے مذہب میں آج کافی اختلافات پائے جاتے ہیں۔

ایسی حالت میں ایک سنجیدہ آدمی کے لئے صرف ایک ہی طریقہ ہے۔ وہ یہ کہ وہ مختلف مذاہب کو تاریخی معیار پر جانچے۔ جو مذہب تاریخی طور پر معتبر اور مستند ثابت ہو اس کو لے لے اور جو مذہب اس تاریخی معیار پر پورا نہ اترے اس کو یہ سمجھ کر چھوڑ دے کہ وہ بعد کے زمانہ میں اپنی اصل حالت میں محفوظ نہ رہ سکا۔

جب ہم اس معیار کو تسلیم کرتے ہیں تو ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں صرف ایک ہی مذہب ہے جو تاریخ کے اصولوں پر مستند ثابت ہوتا ہے اور وہ اسلام ہے۔ اب ہر سنجیدہ آدمی کو یہ کرنا چاہئے کہ وہ اسلام کو اختیار کر لے۔ کیوں کہ اسلام اس کے لئے کوئی الگ دین نہیں۔ یہ دراصل اس کا اپنا ہی مذہب ہے جو صحیح اور محفوظ حالت میں اس تک پہنچ رہا ہے۔

مذاہب کی عالمی انجمن (World Fellowship of Religion) کی تیسری بین اقوامی کانفرنس نئی دہلی میں ہوئی۔ اس موقع پر ۲۷ فروری ۱۹۶۵ کے اجلاس میں یہ مقالہ پیش کیا گیا۔

حقیقت کی تلاش

کائنات ایک بہت بڑی کتاب کی مانند ہمارے سامنے پھیلی ہوئی ہے مگر یہ ایک ایسی انوکھی کتاب ہے جس کے کسی صفحے پر اس کا موضوع اور اس کے مصنف کا نام تحریر نہیں، اگرچہ اس کتاب کا ایک ایک حرف بول رہا ہے کہ اس کا موضوع کیا ہوسکتا ہے اور اس کا مصنف کون ہے ۔

جب کوئی شخص آنکھ کھولتا ہے اور دیکھتا ہے کہ وہ ایک وسیع و عریض کائنات کے درمیان کھڑا ہے تو بالکل قدرتی طور پر اس کے ذہن میں یہ سوال آتا ہے کہ ـــــ "میں کیا ہوں اور یہ کائنات کیا ہے" وہ اپنے آپ کو اور کائنات کو سمجھنے کے لئے بے چین ہوتا ہے۔ اپنی فطرت میں سموئے ہوئے اشارات کو پڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔ دنیا میں وہ جن حالات سے دوچار ہورہا ہے، چاہتا ہے کہ ان کے حقیقی اسباب معلوم کرے۔ غرض اس کے ذہن میں بہت سے سوالات اٹھتے ہیں جن کا جواب معلوم کرنے کے لئے وہ بے قرار ہوتا ہے مگر وہ نہیں جانتا کہ ان کا جواب کیا ہے۔

یہ سوالات محض فلسفیانہ قسم کے سوالات نہیں ہیں بلکہ یہ انسان کی فطرت اور اس کے حالات کا قدرتی نتیجہ ہیں۔ یہ ایسے سوالات ہیں جن سے دنیا میں تقریباً ہر شخص کو ایک بار گزرنا ہوتا ہے ۔ جن کا جواب نہ پانے کی صورت میں کوئی پاگل ہوجاتا ہے، کوئی خودکشی کرلیتا ہے، کسی کی ساری زندگی بے چینیوں میں گذر جاتی ہے، اور کوئی اپنے حقیقی سوال کا جواب نہ پاکر نشہ آور چیزوں یا ظاہری تماشوں میں کھو جاتا ہے اور چاہتا ہے کہ ان میں گم ہوکر اس ذہنی پریشانی سے نجات حاصل کرے۔ وہ جو کچھ حاصل کرسکتا ہے اس کو حاصل کرنے کی کوشش میں اس کو بھلا دیتا ہے جس کو وہ حاصل نہ کرسکا۔

اس سوال کو ہم ایک لفظ میں "حقیقت کی تلاش" کہہ سکتے ہیں۔ لیکن اگر اس کا تجزیہ کریں تو یہ بہت سے سوالات کا مجموعہ نکلے گا۔ یہ سوالات کیا ہیں ان کو مختلف الفاظ میں ظاہر کیا جا سکتا ہے مگر میں آسانی کے لئے ان کو مندرجہ ذیل تین عنوانات کے تحت بیان کروں گا۔

۱۔ خالق کی تلاش

۲۔ معبود کی تلاش

۳۔ اپنے انجام کی تلاش

حقیقت کی تلاش دراصل نام ہے ان ہی تینوں سوالات کا جواب معلوم کرنے کا۔ آپ خواہ جن الفاظ میں بھی اس سوال کی تشریح کریں مگر "حقیقت" وہ اسی کی بدلی ہوئی تعبیر ہو گی اور ان ہی تین عنوانات کے تحت انھیں اکٹھا کیا جا سکے گا۔

بظاہر یہ سوالات ایسے ہیں جن کے بارہ میں ہم کچھ نہیں جانتے، اور نہ کسی پہاڑ کی چوٹی پر ایسا کوئی بورڈ لگا ہوا نظر آتا ہے جہاں ان کا جواب لکھ کر رکھ دیا گیا ہو۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ جو سوال ہے اسی کے اندر اس کا جواب موجود ہے۔ کائنات اپنی حقیقت کی طرف آپ اشارہ کرتی ہے، اگرچہ وہ ہم کو یقینی علم تک نہیں لے جاتی۔ لیکن یہ اشارہ اتنا واضح اور قطعی ہے کہ اگر ہم کو کسی ذریعہ سے حقیقت کا علم حاصل ہو جائے تو ہمارا ذہن پکار اٹھتا ہے کہ یقیناً یہی حقیقت ہے، اس کے سوا کائنات کی کوئی اور حقیقت نہیں ہو سکتی۔

خالق کی تلاش

کائنات کو دیکھتے ہی جو سب سے پہلا سوال ذہن میں آتا ہے وہ یہ کہ اس کا بنانے والا کون ہے اور وہ کون ہے جو اس عظیم کارخانے کو چلا رہا ہے۔ پچھلے زمانوں میں انسان یہ سمجھتا تھا کہ بہت سی اَن دیکھی طاقتیں اس کائنات کی مالک ہیں۔ ایک بڑے خدا کے تحت بہت سے چھوٹے چھوٹے خدا اس کا انتظام کر رہے ہیں۔ اب بھی بہت سے لوگ اس قسم کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ مگر علمی دنیا میں عام طور پر اب یہ نظریہ ترک کیا جا چکا ہے۔ آج یہ ایک مردہ نظریہ ہے نہ کہ زندہ نظریہ۔ موجودہ زمانہ کے وہ لوگ جو اپنے آپ کو ترقی یافتہ کہتے ہیں اور جن کا خیال ہے کہ وہ جدید دور کے انسان ہیں۔ وہ شرک کے بجائے الحاد کے قائل ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ کائنات کسی ذی شعور ہستی کی کارفرمائی نہیں ہے بلکہ ایک اتفاقی حادثہ کا نتیجہ ہے اور جب کوئی واقعہ وجود میں آجائے

تو اس کے سبب سے کچھ دوسرے واقعات بھی وجود میں آئیں گے۔ اس طرح اسباب و واقعات کا ایک لمبا سلسلہ قائم ہو جاتا ہے اور یہی سلسلۂ اسباب ہے جو کائنات کو چلا رہا ہے۔ اس توجیہ کی بنیاد دو چیزوں پر ہے۔ ایک اتفاق، اور دوسرے قانون علت (Law of Causation)

یہ توجیہ بتاتی ہے کہ اب سے تقریباً دو لاکھ ارب سال (۲۰ نیل سال) پہلے کائنات کا وجود نہ تھا۔ اس وقت ستارے تھے اور نہ سیارے، مگر فضا میں مادہ موجود تھا۔ یہ مادہ اس وقت جمی ہوئی ٹھوس حالت میں نہ تھا، بلکہ اپنے ابتدائی ذرے یعنی برقیے اور پروٹونوں کی شکل میں پوری فضائے بسیط میں یکساں طور پر پھیلا ہوا تھا۔ گویا انتہائی چھوٹے چھوٹے ذرات کا ایک غبار تھا جس سے کائنات بھری ہوئی تھی۔ اس وقت مادہ بالکل توازن کی حالت میں تھا، اس میں کسی قسم کی حرکت نہ تھی۔ ریاضی کے نقطۂ نگاہ سے یہ توازن ایسا تھا کہ اگر اس میں کوئی ذرا سا بھی خلل ڈال دے تو پھر یہ قائم نہیں رہ سکتا، یہ خلل بڑھتا ہی چلا جائے گا۔ اگر اس ابتدائی خلل کو مان لیجئے تو ان لوگوں کا خیال ہے کہ اس کے بعد کے تمام واقعات علمِ ریاضی کے ذریعہ ثابت ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ ایسا ہوا کہ مادے کے اس بادل میں خفیف سا خلل واقع ہوا جیسے کسی حوض کے پانی کو کوئی ہاتھ ڈال کر ہلا دے۔ کائنات کی پرسکون دنیا میں یہ اضطراب کس نے پیدا کیا، اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔ لیکن خلل ہوا اور یہ خلل بڑھتا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مادہ سمٹ سمٹ کر مختلف جگہوں میں جمع ہونا شروع ہو گیا۔ یہی وہ جمع شدہ مادہ ہے جس کو ہم ستارے سیارے اور سحابیئے کہتے ہیں۔

کائنات کی یہ توجیہ سائنس کی طرف سے پیش کی گئی تھی مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ اس قدر بودی اور کمزور توجیہ ہے کہ خود سائنس دانوں کو بھی اس پر کبھی شرحِ صدر حاصل نہ ہو سکا۔ یہ توجیہ اس حقیقت کو تسلیم کرتی ہے کہ اسے نہیں معلوم کہ کائنات کو پہلی بار کس نے حرکت دی مگر اس کے باوجود اس کا دعویٰ ہے کہ اس نے کائنات کے محرکِ اول کو معلوم کر لیا ہے، اور اس محرکِ اول کا نام اس کے نزدیک اتفاق ہے۔

سوال یہ ہے کہ جب کائنات میں صرف غیر متحرک مادہ تھا، اس کے سوا کوئی چیز موجود نہ تھی تو یہ عجیب و غریب قسم کا اتفاق کہاں سے وجود میں آ گیا جس نے ساری کائنات کو حرکت دے دی۔ جس واقعہ کے اسباب نہ مادہ کے اندر موجود تھے اور نہ مادہ کے باہر۔ وہ واقعہ وجود میں آیا تو کیسے۔ اس توجیہ کا یہ نہایت دل چسپ تضاد ہے کہ وہ ہر واقعہ سے پہلے ایک واقعہ کا موجود ہونا ضروری قرار دیتی ہے جو بعد کو ظاہر ہونے والے واقعہ کا سبب بن سکے مگر اس توجیہ کی ابتدا ایک ایسے واقعہ

سے ہوتی ہے جس سے پہلے اس کا سبب موجود نہیں ۔ یہی وہ بے بنیاد مفروضہ ہے جس پر کائنات کی اتفاقی پیدائش کے نظریہ کی پوری عمارت کھڑی کر دی گئی ہے۔

پھر یہ کائنات اگر محض اتفاق سے وجود میں آئی ہے تو کیا واقعات لازمی طور پر وہی رخ اختیار کرنے پر مجبور تھے جو انھوں نے اختیار کیا۔ کیا اس کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتا تھا۔ کیا ایسا ممکن نہیں تھا کہ ستارے آپس میں ٹکرا کر تباہ ہو جائیں۔ مادہ میں حرکت پیدا ہونے کے بعد کیا یہ ضروری تھا کہ یہ محض حرکت نہ رہے بلکہ ایک ارتقائی حرکت بن جائے اور حیرت انگیز تسلسل کے ساتھ موجودہ کائنات کو وجود میں لانے کی طرف دوڑنا شروع کر دے۔

آخر وہ کون سی منطق تھی جس نے ستاروں کے وجود میں آتے ہی ان کو لامتناہی خلا میں نہایت باقاعدگی کے ساتھ پھرانا شروع کر دیا۔ پھر وہ کون سی منطق تھی جس نے کائنات کے ایک بعید ترین گوشہ میں نظامِ شمسی کو وجود دیا۔ پھر وہ کون سی منطق تھی جس سے ہمارے کرۂ زمین پر وہ عجیب و غریب تبدیلیاں ہوئیں جن کی وجہ سے یہاں زندگی کا قیام ممکن ہو سکا اور جن تبدیلیوں کا سراغ آج تک کائنات کی بیشمار دنیاؤں میں سے کسی ایک دنیا میں بھی معلوم نہیں کیا جا سکا ہے۔ پھر وہ کون سی منطق تھی جو ایک، خاص مرحلہ پر بے جان مادہ سے جاندار مخلوق پیدا کرنے کا سبب بن گئی۔ کیا اس بات کی کوئی معقول توجیہ کی جا سکتی ہے کہ زمین پر زندگی کس طرح اور کیوں وجود میں آئی اور کس قانون کے تحت مسلسل پیدا ہوتی چلی جا رہی ہے۔

پھر وہ کون سی منطق تھی جس نے کائنات کے ایک چھوٹے سے رقبہ میں حیرت انگیز طور پر وہ تمام چیزیں پیدا کر دیں جو ہماری زندگی اور ہمارے تمدن کے لئے درکار تھیں، پھر وہ کون سی منطق ہے جو ان حالات کو ہمارے لئے باقی رکھے ہوئے ہے۔ کیا محض ایک اتفاق کا پیش آجانا اس بات کی کافی وجہ تھی کہ یہ سارے واقعات اس قدر حسنِ ترتیب کے ساتھ مسلسل پیش آتے چلے جائیں اور اربوں اور کھربوں سال تک ان کا سلسلہ جاری رہے اور پھر بھی ان میں کوئی فرق نہ آنے پائے۔ کیا اس بات کی کوئی واقعی توجیہ کی جا سکتی ہے کہ محض اتفاق سے پیش آنے والے واقعہ میں لزوم کی صفت کہاں سے آگئی اور اتنے عجیب و غریب طریقہ پر مسلسل ارتقاء کرنے کا رجحان اس میں کہاں سے پیدا ہو گیا۔

یہ اس سوال کا جواب تھا کہ کائنات کیسے پیدا ہوئی۔ اس کے بعد یہ سوال اٹھا کہ اس کا چلانے والا کون ہے۔ وہ کون ہے جو اس عظیم کارخانے کو اس قدر منظم طریقہ پر حرکت دے

رہا ہے۔ اس توجیہ میں جس کو کائنات کا خالق قرار دیا گیا ہے اسی کو کائنات کا حاکم نہیں قرار دیا جاسکتا۔ یہ توجیہ عین اپنی ساخت کے اعتبار سے دو خدا چاہتی ہے۔ کیوں کہ حرکتِ اول کی توجیہ کے لئے تو اتفاق کا نام لیا جاسکتا ہے مگر اس کے بعد کی مسلسل حرکت کو کسی حال میں بھی اتفاق نہیں کہا جاسکتا۔ اس کی توجیہ کے لئے دوسرا خدا تلاش کرنا پڑے گا۔

اس مشکل کو حل کرنے کے لئے اصول تعلیل (Principle of Causation) پیش کیا گیا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ حرکت اول کے بعد کائنات میں علت اور معلول کا ایک ایسا سلسلہ قائم ہو گیا ہے کہ ایک کے بعد ایک تمام واقعات پیش آتے چلے جا رہے ہیں، بالکل اسی طرح جیسے بچے بہت سی اینٹیں کھڑی کر کے کنارے کی ایک اینٹ گرا دیتے ہیں تو اس کے بعد کی تمام اینٹیں خود بخود گرتی چلی جاتی ہیں۔ جو واقعہ ظہور میں آتا ہے اس کا سبب کائنات کے باہر کہیں موجود نہیں ہے بلکہ ناقابل تسخیر قوانین کے تحت حالات ماقبل کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے۔ اور یہ سابقہ حالات بھی اپنے سے پہلے واقعات کا لازمی نتیجہ تھے۔ اس طرح کائنات میں علت اور معلول کا ایک لامتناہی سلسلہ قائم ہو گیا ہے۔ حتی کہ جس صورت میں تاریخِ عالم کا آغاز ہوا، اس نے آئندہ سلسلہ واقعات کا قطعی فیصلہ کر دیا ہے۔ جب ابتدائی صورت ایک دفعہ معین ہو گئی تو قدرت صرف ایک ہی طریق سے منزل مقصود تک پہنچ سکتی تھی۔ گویا کائنات جس روز پیدا ہوئی اس کی آئندہ تاریخ بھی اسی دن متعین ہو چکی ہے۔

اس اصول کو قدرت کا اساسی قانون مقرر کرنا سترہویں صدی کا ایک بہت بڑا واقعہ تھا چنانچہ یہ تحریک شروع ہوئی کہ تمام کائنات کو ایک مشین ثابت کیا جائے۔ انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں یہ تحریک اپنے پورے عروج پر آگئی۔ یہ زمانہ سائنس داں انجینیروں کا تھا جن کی دلی خواہش تھی کہ قدرت کے مشینی ماڈل بنائے جائیں۔ اسی زمانہ میں ہیلم ہولٹز (Helm Holtz) نے کہا تھا کہ تمام قدرتی سائنسوں کا آخری مقصد اپنے آپ کو میکانکس میں منتقل کر لینا ہے۔ اگرچہ اس اصول کے مطابق کائنات کے تمام مظاہر کی تشریح کرنے میں ابھی سائنسدانوں کو کامیابی نہیں ہوئی تھی مگر ان کا یقین تھا کہ کائنات کی تشریح میکانکی پیرائے میں ہوسکتی ہے وہ سمجھتے تھے کہ صرف تھوڑی سی کوشش کی ضرورت ہے اور بالآخر تمام عالم ایک مکمل چلتی ہوئی مشین ثابت ہو جائے گا۔

ان باتوں کا انسانی زندگی سے تعلق صاف ظاہر تھا۔ اصولِ تعلیل کی ہر توسیع اور قدرت

کی ہر کامیاب میکانکی تشریح نے اختیار انسانی پر یقین کرنا محال بنادیا، کیوں کہ اگر یہ اصول تمام قدرت پر حاوی ہے تو زندگی اس سے کیوں مستثنٰی ہو سکتی ہے۔ اس طرز فکر کے نتیجہ میں سترھویں اور اٹھارھویں صدی کے میکانکی فلسفے وجود میں آئے جب یہ دریافت ہوا کہ (Living Cell) جاندار خلیہ بھی بے جان مادہ کی طرح محض کیمیاوی جوہروں سے بنا ہے تو فوراً سوال پیدا ہوا کہ وہ خاص اجزاء جن سے ہمارے جسم و دماغ بنے ہوئے ہیں کیوں کر اصول تعلیل کے دائرہ سے باہر ہو سکتے ہیں چنانچہ یہ گمان کیا گیا بلکہ بڑے جوش کے ساتھ دعویٰ کر دیا گیا کہ زندگی بھی ایک خالص مشین ہے یہاں تک کہا گیا کہ نیوٹن، باخ (Bach) اور مایکل انجلو (Michel Angelo) کے دماغ کسی پرنٹنگ مشین سے صرف پیچیدگی میں مختلف تھے اور ان کا کام صرف یہ تھا کہ بیرونی محرکات کا مکمل جواب دیں۔

مگر سائنس اس سخت اور غیر معتدل قسم کے اصولِ علیت کی اب قائل نہیں ہے۔ نظریۂ اضافیت اصول تعلیل کو دھوکے (Elusion) کے لفظ سے یاد کرتا ہے۔ انیسویں صدی کے آخر ہی میں سائنس پر یہ واضح ہو گیا تھا کہ کائنات کے بہت سے مظاہر، بالخصوص روشنی اور قوت کشش، میکانکی تشریح کی ہر کوشش کو ناکام بنا دیتے ہیں۔ یہ بحث ابھی جاری تھی کہ کیا ایسی مشین بنائی جا سکتی ہے جو نیوٹن کے افکار، باخ کے جذبات اور مایکل انجلو کے خیالات کا اعادہ کر سکے مگر سائنس والوں کو بڑی تیزی سے یقین ہوتا جا رہا تھا کہ شمع کی روشنی اور سیب کا گرنا کوئی مشین نہیں دہرا سکتی۔ قدیم سائنس نے بڑے وثوق سے اعلان کیا تھا کہ قدرت صرف ایک ہی راستہ اختیار کر سکتی ہے جو اول روز سے علت اور معلول کی مسلسل کڑی کے مطابق ابد تک کے لئے معین ہو چکا ہے۔ مگر بالآخر سائنس کو خود یہ تسلیم کرنا پڑا کہ کائنات کا ماضی اس قدر اٹل طور پر اس کے مستقبل کا سبب نہیں ہے جیسا کہ پہلے خیال کیا جاتا تھا۔ موجودہ معلومات کی روشنی میں سائنس والوں کی ایک بڑی اکثریت کا اب اس بات پر اتفاق ہے کہ علم کا دریا ہمیں ایک غیر میکانکی حقیقت (Non-mechanical Reality) کی طرف لئے جا رہا ہے۔

کائنات کی پیدائش اور اس کی حرکت کے بارہ میں یہ دونوں نظریئے جو سائنسی ترقیوں کے ساتھ وجود میں آئے تھے اب تک یقین کی دولت سے محروم ہیں۔ جدید تحقیقات ان کی بنیاد کو مضبوط نہیں بناتی بلکہ اور کمزور کر دیتی ہے۔ اس طرح گویا سائنس خود ہی اس نظریہ کی تردید کر رہی ہے، اب انسان دوبارہ اسی منزل پر پہونچ گیا ہے جس کو چھوڑ کر اس نے اپنا

نیا سفر شروع کیا تھا۔

معبود کی تلاش

یہ خالق کی تلاش کا مسئلہ تھا۔ اس کے بعد دوسری چیز جو انسان جاننا چاہتا ہے وہ یہ کہ "میرا معبود کون ہے" ہم اپنی زندگی میں صریح طور پر ایک خلا محسوس کرتے ہیں مگر ہم نہیں جانتے کہ اس خلا کو کیسے پر کریں۔ یہی خلا کا احساس ہے جس کو میں نے "معبود کی تلاش" سے تعبیر کیا ہے۔ یہ احساس دو پہلوؤں سے ہوتا ہے۔

اپنے وجود اور باہر کی دنیا پر جب ہم غور کرتے ہیں تو دو نہایت شدید جذبے ہمارے اندر پیدا ہوتے ہیں۔ پہلا شکر اور احسان مندی کا اور دوسرا کمزوری اور عجز کا۔

ہم اپنی زندگی کے جس گوشہ میں بھی نظر ڈالتے ہیں ہمیں صاف دکھائی دیتا ہے کہ ہماری زندگی کسی کے احسانات سے ڈھکی ہوئی ہے یہ دیکھ کر دینے والے کے لئے ہمارے اندر بے پناہ جذبہ شکر امنڈتا ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ اپنی بہترین عقیدتوں کو اپنے محسن پر قربان کر سکیں۔ یہ تلاش ہمارے لئے محض ایک فلسفیانہ نوعیت کی چیز نہیں ہے بلکہ ہماری نفسیات سے اس کا گہرا تعلق ہے یہ سوال محض ایک خارجی مسئلہ کو حل کرنے کا سوال نہیں ہے بلکہ یہ ہماری ایک اندرونی طلب ہے اور ہمارا پورا وجود اس سوال کا جواب معلوم کرنا چاہتا ہے۔

غور کیجئے، کیا کوئی شریف آدمی اس حقیقت کو نظر انداز کر سکتا ہے کہ وہ کائنات میں ایک مستقل واقعہ کی حیثیت سے موجود ہے حالانکہ اس میں اس کی اپنی کوششوں کا کوئی دخل نہیں ہے وہ اپنے آپ کو ایک ایسے جسم میں پا رہا ہے جس سے بہتر جسم کا وہ تصور نہیں کر سکتا حالانکہ اس جسم کو اس نے خود نہیں بنایا ہے۔ اس کو ایسی عجیب و غریب قسم کی ذہنی قوتیں حاصل ہیں جو کسی بھی دوسرے جاندار کو نہیں دی گئی ہیں حالاں کہ ان قوتوں کو حاصل کرنے کے لئے اس نے کچھ بھی نہیں کیا ہے اور نہ وہ کچھ کر سکتا ہے۔ ہمارا وجود ذاتی نہیں ہے بلکہ عطیہ ہے۔ یہ عطیہ کس نے دیا ہے، انسانی فطرت اس سوال کا جواب معلوم کرنا چاہتی ہے تاکہ وہ اپنے اس عظیم محسن کا شکر ادا کر سکے۔

پھر اپنے جسم کے باہر دیکھئے۔ دنیا میں ہم اس حال میں پیدا ہوتے ہیں کہ ہمارے پاس اپنا کچھ بھی نہیں ہوتا، نہ ہم کو کائنات کے اوپر کوئی اختیار حاصل ہے کہ ہم اس کو اپنی ضرورت

کے مطابق بنا سکیں۔ ہماری ہزاروں ضرورتیں ہیں۔ مگر کسی ایک ضرورت کو بھی ہم خود سے پورا نہیں کر سکتے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں حیرت انگیز طور پر ہماری تمام ضرورتوں کو پورا کرنے کا انتظام کیا گیا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کائنات اپنے تمام ساز و سامان کے ساتھ اس بات کی منتظر ہے کہ انسان پیدا ہو اور وہ اس کی خدمت میں لگ جائے۔

مثال کے طور پر آواز کو لیجئے جس کے ذریعہ سے ہم اپنا خیال دوسروں تک پہونچاتے ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہوا کہ ہمارے ذہن میں پیدا ہونے والے خیالات زبان کا ارتعاش بن کر دوسرے کے کان تک پہونچیں اور وہ ان کو قابل فہم آوازوں کی صورت میں سن سکے۔ اس کے لئے ہمارے اندر اور باہر بیشمار انتظامات کئے گئے ہیں جن میں سے ایک وہ درمیانی واسطہ ہے جس کو ہم ہوا کہتے ہیں۔ ہم جو الفاظ بولتے ہیں وہ بے آواز لہروں کی صورت میں ہوا پر اسی طرح سفر کرتے ہیں جس طرح پانی کی سطح پر موجیں پیدا ہوتی ہیں اور بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ میرے منھ سے نکلی ہوئی آواز کے آپ تک پہونچنے کے لئے درمیان میں ہوا کا موجود ہونا ضروری ہے۔ اگر یہ درمیانی واسطہ نہ ہو تو آپ میرے ہونٹ ہلتے ہوئے دیکھیں گے مگر میری آواز نہ سنیں گے۔ مثال کے طور پر ایک بند فانوس کے اندر برقی گھنٹی رکھ کر اسے بجایا جائے تو اس کی آواز صاف سنائی دے گی۔ لیکن اگر فانوس کے اندر کی ہوا کو پوری طرح نکال دیا جائے اور اس کے بعد گھنٹی بجائی جائے تو آپ شیشہ کے اندر گھنٹی کو بجتا ہوا دیکھیں گے مگر اس کی آواز بالکل سنائی نہ دے گی۔ کیوں کہ گھنٹی کے بجنے سے جو ارتعاش پیدا ہوتا ہے اس کو قبول کر کے آپ کے کانوں تک پہنچانے کے لئے فانوس کے اندر ہوا موجود نہیں ہے۔

مگر یہ ذریعہ بھی ناکافی ہے کیونکہ ہوا کے ذریعہ ہماری آواز پانچ سکنڈ میں صرف ایک میل کا فاصلہ طے کرتی ہے۔ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ ہوا کا ذریعہ صرف قریبی ماحول میں گفتگو کے لئے کارآمد ہے، وہ ہماری آواز کو دور تک نہیں پہنچا سکتا۔ اگر آواز صرف ہوا کے ذریعہ پھیلتی تو اس کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانا ممکن نہ ہوتا۔ مگر قدرت نے اس کے لئے ہمیں ایک اور انتہائی تیز رفتار ذریعہ مہیا کیا ہے، یہ روشنی یا برقی رو ہے جس کی رفتار ایک سکنڈ میں ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل ہے۔ لاسلکی پیغامات میں اسی ذریعہ سے کام لیا جاتا ہے۔ جب کوئی مقرر ریڈیو اسٹیشن میں لگے ہوئے مائکروفون کے قریب آواز نکالتا ہے تو مائکروفون آواز کو جذب کر کے اسے برقی رو میں تبدیل کر دیتا ہے اور تار کے ذریعہ اس کو آلۂ نشر یا ٹرانس میٹر تک بھیج دیتا ہے۔

آلات نشر آواز کے پہونچتے ہی مرتعش ہو کر فضا میں وہی ارتعاش پیدا کر دیتے ہیں۔ اس طرح پانچ سکنڈ میں ایک میل چلنے والی آواز برقی لہروں میں تبدیل ہو کر ایک سکنڈ میں دو لاکھ میل کی رفتار حاصل کر لیتی ہے۔ اور دم بھر میں ساری دنیا میں پھیل جاتی ہے۔ یہی لاسلکی موجیں ہیں جن کو ہمارے ریڈیو سٹ کی آواز گیر مشین قبول کر کے بلند آواز میں ان کا اعادہ کر دیتی ہے اور پھر ہزاروں میل دور بولی ہوئی آواز کو ہم کسی تاخیر کے بغیر سننے لگتے ہیں۔

یہ ان بیشمار انتظامات میں سے ایک ہے جس کو میں نے بیان نہیں کیا ہے بلکہ اس کا صرف نام لیا ہے۔ اگر اس کا اور دوسری چیزوں کا تفصیلی ذکر کیا جائے تو اس کے لئے کروروں صفحے درکار ہوں گے اور پھر بھی ان کا بیان ختم نہ ہوگا۔

یہ عطیات جن سے ہر آن آدمی دوچار ہو رہا ہے اور جن کے بغیر اس زمین پر انسانی زندگی اور تمدن کا کوئی تصور نہیں کیا جا سکتا، انسان جاننا چاہتا ہے کہ یہ سب کس نے اس کے لئے مہیّا کیا ہے ہر آن جب وہ کسی نعمت سے دوچار ہوتا ہے تو اس کے دل میں بے پناہ جذبۂ شکر امنڈتا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ اپنے محسن کو پائے اور اپنے آپ کو اس کے قدموں میں ڈال دے۔ محسن کے احسانات کو ماننا، اس کو اپنے دل کی گہرائیوں میں جگہ دینا اور اس کی خدمت میں اپنے بہترین جذبات کو نذر کرنا یہ انسانی فطرت کا شریف ترین جذبہ ہے۔ ہر آدمی جو اپنی زندگی اور کائنات پر غور کرتا ہے اس کے اندر نہایت شدت سے یہ جذبہ ابھرتا ہے۔ پھر کیا اس جذبہ کا کوئی جواب نہیں۔ کیا انسان اس کائنات کے اندر ایک یتیم بچہ ہے جس کے اندر امنڈتے ہوئے جذبات محبت کی تسکین کے لئے کوئی ہستی موجود نہ ہو۔ کیا یہ ایک ایسی کائنات ہے جہاں احسانات ہیں مگر محسن کا پتہ نہیں جہاں جذبہ ہے مگر جذبہ کی تسکین کا کوئی ذریعہ نہیں۔

یہ معبود کی تلاش کا ایک پہلو ہے۔ اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ انسان کے حالات فطری طور پر تقاضا کرتے ہیں کہ کائنات کے اندر اس کا کوئی سہارا ہو۔ اگر ہم آنکھ کھول کر دیکھیں تو ہم اس دنیا میں ایک انتہائی عاجز اور بے بس مخلوق ہیں۔ ذرا اس خلا کا تصور کیجئے جس میں ہماری یہ زمین سورج کے گرد چکر لگا رہی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ زمین کی گولائی تقریباً ۲۵ ہزار میل ہے۔ اور وہ ناچتے ہوئے لٹو کے مانند اپنے محور پر مسلسل اس طرح گھوم رہی ہے کہ ہر ۲۴ گھنٹے میں ایک چکر پورا ہو جاتا ہے۔ گویا اس کی رفتار تقریباً ایک ہزار میل فی گھنٹہ ہے۔ اسی کے ساتھ وہ سورج کے چاروں طرف اٹھارہ کرور ساٹھ لاکھ میل کے لمبے دائرہ میں نہایت تیزی سے دوڑ رہی ہے۔

خلا کے اندر اس قدر تیز دوڑتی ہوئی زمین پر ہمارا وجود قائم رکھنے کے لئے زمین کی رفتار کو ایک خاص اندازہ کے مطابق رکھا گیا ہے اگر ایسا نہ ہو تو زمین کے اوپر انسان کی حالت ان سنگ ریزوں کی مانند ہو جائے جو کسی متحرک پہیہ پر رکھ دئیے گئے ہوں، اسی کے ساتھ مزید انتظام یہ ہے کہ زمین کی کشش ہم کو کھینچے ہوئے ہے اور اوپر سے ہوا کا زبردست دباؤ پڑتا ہے۔ ہوا کے ذریعہ جو دباؤ پڑ رہا ہے وہ جسم کے ہر مربع انچ پر پندرہ پونڈ تک معلوم کیا گیا ہے، یعنی ایک اوسط آدمی کے سارے جسم پر تقریباً ۲۸۰ من کا دباؤ۔ ان حیرت انگیز انتظامات نے ہم کو خلا میں مسلسل دوڑتی ہوئی زمین کے چاروں طرف قائم کر رکھا ہے۔

پھر ذرا سورج پر غور کیجئے۔ سورج کی جسامت آٹھ لاکھ ۶۵ ہزار میل ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہماری زمین سے دس لاکھ گنا بڑا ہے۔ یہ سورج آگ کا دہکتا ہوا سمندر ہے جس کے قریب کوئی بھی چیز ٹھوس حالت میں نہیں رہ سکتی۔ زمین اور سورج کے درمیان اس وقت تقریباً ساڑھے نو کروڑ میل کا فاصلہ ہے، اگر اس کے بجائے وہ اس کے نصف فاصلہ پر ہو تو سورج کی گرمی سے چیزیں جلنے لگیں۔ اور اگر وہ چاند کی جگہ یعنی دو لاکھ چالیس ہزار میل کے فاصلہ پر آجائے تو زمین پگھل کر بخارات میں تبدیل ہو جائے۔ یہی سورج ہے جس سے زمین پر زندگی کے تمام مظاہر قائم ہیں۔ اس مقصد کے لئے اس کو ایک خاص فاصلہ پر رکھا گیا ہے۔ اگر وہ دور چلا جائے تو زمین برف کی طرح جم جائے اور اگر قریب آجائے تو ہم سب لوگ جل بھن کر خاک ہو جائیں۔

پھر ذرا اس کائنات کی وسعت کو دیکھئے اور اس قوتِ کشش پر غور کیجئے جو اس عظیم کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے۔ کائنات ایک بے انتہا وسیع کارخانہ ہے، اس کی وسعت کا اندازہ ماہرین فلکیات کے نزدیک یہ ہے کہ روشنی جس کی رفتار ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سکنڈ ہے، اس کو کائنات کے گرد ایک چکر طے کرنے میں کئی ارب برس درکار ہوں گے۔ یہ نظام شمسی جس کے اندر ہماری زمین ہے، بظاہر بہت بڑا معلوم ہوتا ہے مگر پوری کائنات کے مقابلہ میں اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ کائنات میں اس سے بہت بڑے بڑے بے شمار ستارے لامحدود وسعتوں میں پھیلے ہوئے ہیں جن میں بہت سے اتنے بڑے ہیں کہ ہمارا پورا نظام شمسی اس کے اوپر رکھا جا سکتا ہے۔ جو قوت کشش ان بیشمار دنیاؤں کو سنبھالے ہوئے ہے، اس کی عظمت کا تصور اس سے کیجئے کہ سورج جس بے پناہ طاقت سے زمین کو

اپنی طرف کھینچ رہا ہے اور اس کو وسیع ترین فضا میں گر کر برباد ہو جانے سے روکتا ہے، یہ غیر مرئی طاقت اس قدر قوی ہے کہ اگر اس مقصد کے لئے کسی مادی شئے سے زمین کو باندھنا پڑتا تو جس طرح گھاس کی پتیاں زمین کو ڈھانکے ہوئے ہیں، اسی طرح دھاتی تاروں سے کرۂ ارض ڈھک جاتا۔

ہماری زندگی بالکلیہ ایسی طاقتوں کے رحم و کرم پر ہے جن پر ہمارا کوئی اختیار نہیں۔ انسان کی زندگی کے لئے دنیا میں جو انتظامات ہیں اور جن کی موجودگی کے بغیر انسانی زندگی کا تصور نہیں کیا جا سکتا، وہ اتنے بلند پیمانہ پر ہو رہے ہیں اور ان کو وجود میں لانے کے لئے اتنی غیر معمولی قوت تصرف درکار ہے کہ انسان خود سے انھیں وجود میں لانے کا تصور نہیں کر سکتا موجودات کے لئے جو طریق عمل مقرر کیا گیا ہے، اس کا مقرر کرنا تو درکنار اس پر کنٹرول کرنا بھی انسان کے بس کی بات نہیں۔ وہ دیکھتا ہے کہ اگر کائنات کی غیر معمولی قوتیں میرے ساتھ ہم آہنگی نہ کریں تو میں زمین پر ٹھہر بھی نہیں سکتا، اس کے اوپر ایک متمدن زندگی کی تعمیر تو بہت دور کی بات ہے۔

ایسی ایک کائنات کے اندر جب انسان اپنے حقیر وجود کو دیکھتا ہے تو وہ اپنے آپ کو اس سے بھی زیادہ بے بس محسوس کرنے لگتا ہے جتنا کہ سمندر کی موجوں کے درمیان ایک چیونٹی اپنے آپ کو بچانے کی جد و جہد کر رہی ہو۔ وہ بے اختیارانہ چاہتا ہے کہ کوئی ہو جو اس اتھاہ کائنات میں اس کا سہارا بن سکے۔ وہ ایک ایسی ہستی کی پناہ ڈھونڈھنا چاہتا ہے جو کائنات کی قوتوں سے بالاتر ہو اور جس کی پناہ میں آجانے کے بعد وہ اپنے آپ کو محفوظ و مامون تصور کر سکے۔

یہ دو جذبے ہیں جن کو میں نے معبود کی تلاش کا عنوان دیا ہے۔ معبود کی تلاش در اصل ایک فطری جذبہ ہے جس کا مطلب ایک ایسی ہستی کی تلاش ہے جو آدمی کی محبت اور اس کے اعتماد کا مرکز بن سکے۔ موجودہ زمانہ میں قوم، وطن اور ریاست کو انسان کی اس طلب کا جواب بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ جدید تہذیب یہ کہتی ہے کہ اپنی قوم، اپنے وطن اور اپنی ریاست کو یہ مقام دو کہ وہ تمہاری عقیدتوں کا مرکز بنے اور اس سے وابستگی کو اپنا سہارا بناؤ۔ ان چیزوں کو معبود کے نام پر پیش نہیں کیا جاتا مگر زندگی میں ان کو جو مقام دیا گیا ہے وہ تقریباً وہی ہے جو در اصل ایک معبود کا ہونا چاہئے۔ مگر ان چیزوں

کو معبود کی جگہ دینا بالکل ایسا ہی ہے جیسے کسی کو ایک رفیق زندگی کی ضرورت ہو تو اس کی خدمت میں آپ پتھر کی ایک سل پیش کر دیں۔ کھلی ہوئی بات ہے کہ انسان کے اندر تلاش کا یہ جذبہ جو ابھرتا ہے اس کے اسباب انسانی نفسیات میں بہت گہرائی تک پھیلے ہوئے ہیں، وہ ایک ایسی ہستی کی تلاش میں ہے جو ساری کائنات پر محیط ہو۔ اس طلب کا جواب کسی جغرافیائی خطہ میں نہیں مل سکتا۔ یہ چیزیں زیادہ سے زیادہ ایک سماج کی تعمیر میں کچھ مدد دے سکتی ہیں مگر وہ انسان کے تلاش معبود کے جذبے کی تسکین نہیں بن سکتیں، اس کے لئے ایک کائناتی وجود درکار ہے۔ انسان کو اپنی محبتوں کے مرکز کے لئے ایک ایسا وجود چاہیئے جس نے زمین و آسمان کو بنایا ہو۔ اپنے سہارے کے لئے اسے ایک ایسی طاقت کی تلاش ہے جو کائنات کے اوپر حکمراں ہو۔ جب تک انسان ایسے ایک وجود کو نہیں پائے گا اس کا خلا بدستور باقی رہے گا، کوئی دوسری چیز اسے پر کرنے والی نہیں بن سکتی

انجام کی تلاش

حقیقت کی تلاش کا تیسرا جزء اپنے انجام کی تلاش ہے۔ آدمی یہ جاننا چاہتا ہے کہ وہ کہاں سے آیا ہے اور کہاں جائے گا۔ وہ اپنے اندر بہت سے حوصلے اور تمنائیں پاتا ہے وہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ ان کی تسکین کس طرح ہوگی۔ وہ موجودہ محدود زندگی کے مقابلہ میں ایک طویل تر زندگی چاہتا ہے مگر نہیں جانتا کہ وہ اس کو کہاں پائے گا۔ اس کے اندر بہت سے اخلاقی اور انسانی احساسات ہیں جو دنیا میں بری طرح پامال کئے جا رہے ہیں۔ اس کے ذہن میں یہ سوال اٹھتا ہے کہ کیا وہ اپنی پسندیدہ دنیا کو حاصل نہ کر سکے گا۔ یہ سوالات کس طرح انسان کے اندر سے ابلتے ہیں اور کائنات کا مطالعہ کس طرح اس کے ذہن میں یہ سوال پیدا کرتا ہے، اس موقع پر اس کی تھوڑی سی تفصیل مناسب ہوگی۔

ماہرین حیاتیات کا خیال ہے کہ انسان اپنی موجودہ شکل میں تین لاکھ برس سے زمین پر موجود ہے۔ اس کے مقابلہ میں کائنات کی عمر بہت زیادہ ہے یعنی دو لاکھ ارب سال (۲۰ نیل سال)، اس سے پہلے کائنات برقی ذرات کے ایک غبار کی شکل میں تھی، پھر اس میں حرکت ہوئی اور مادہ سمٹ سمٹ کر مختلف جگہوں میں جمع ہونا شروع ہو گیا۔ یہی وہ جمع شدہ مادہ ہے جس کو ہم ستارے، سیارے یا سحابئے کہتے ہیں۔ یہ مادی ٹکڑے گیس کے

مہیب گولے کی شکل میں نامعلوم مدت تک فضا میں گردش کرتے رہے۔ تقریباً دو ارب سال پہلے ایسا ہوا کہ کائنات کا کوئی بڑا استارہ فضا میں سفر کرتا ہوا آفتاب کے قریب آنکلا جو اس وقت اب سے بہت بڑا تھا۔ جس طرح چاند کی کشش سے سمندر میں اونچی اونچی لہریں اٹھتی ہیں اسی طرح اس دوسرے ستارے کی کشش سے ہمارے آفتاب پر ایک عظیم طوفان برپا ہوا، زبردست لہریں پیدا ہوئیں جو رفتہ رفتہ نہایت بلند ہوئیں اور قبل اس کے کہ وہ ستارہ آفتاب سے دور ہٹنا شروع ہو، اس کی قوت کشش اتنی زیادہ بڑھ گئی کہ آفتاب کی ان زبردست گیسی لہروں کے کچھ حصے ٹوٹ کر ایک جھٹکے کے ساتھ دور فضا میں نکل گئے۔ یہی بعد کو ٹھنڈے ہو کر نظام شمسی کے توابع بنے۔ اس وقت یہ سب ٹکڑے آفتاب کے گرد گھوم رہے ہیں اور ان ہی میں سے ایک ہماری زمین ہے۔

زمین ابتداءً ایک شعلہ کی حالت میں سورج کے گرد گھوم رہی تھی، مگر پھر فضا میں مسلسل حرارت خارج کرنے کی وجہ سے ٹھنڈی ہونا شروع ہوئی، یہ عمل کروروں برس ہوتا رہا یہاں تک کہ وہ بالکل سرد ہو گئی۔ مگر سورج کی گرمی اب بھی اس پر پڑ رہی تھی جس کی وجہ سے بخارات اٹھنا شروع ہوئے اور گھٹاؤں کی شکل میں اس کی فضا کے اوپر چھا گئے۔ پھر یہ بادل برسنا شروع ہوئے اور ساری زمین پانی سے بھر گئی۔ زمین کا اوپری حصہ اگرچہ ٹھنڈا ہو گیا تھا مگر اس کا اندرونی حصہ اب بھی گرم تھا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زمین سکڑنے لگی۔ اس کی وجہ سے زمین کے اندر کی گرم گیسوں پر دباؤ پڑا اور وہ باہر نکلنے کے لئے بے قرار ہو گئیں، تھوڑے تھوڑے عرصے کے بعد زمین پھٹنے لگی۔ جگہ جگہ بڑے بڑے شگاف پڑ گئے، اس طرح بحری طوفانوں، خوفناک زلزلوں اور آتش فشاں دھماکوں میں ہزاروں سال گزر گئے۔ ان ہی زلزلوں سے زمین کا کچھ حصہ اوپر ابھر آیا اور کچھ حصہ دب گیا۔ دبے ہوئے حصوں میں پانی بھر گیا اور وہ سمندر کہلائے اور ابھرے ہوئے حصوں نے براعظم کی صورت اختیار کی بعض اوقات یہ ابھار اس طرح واقع ہوا کہ بڑی بڑی اونچیں باڑھیں سی بن گئیں، یہ دنیا کے پہلے پہاڑ تھے۔

ماہرین ارضیات کا خیال ہے کہ ایک ارب ۲۳ کرور سال ہوئے، جب پہلی بار زمین پر زندگی پیدا ہوئی۔ یہ چھوٹے چھوٹے کیڑے تھے جو پانی کے کنارے وجود میں آئے۔ اس کے بعد مختلف قسم کے جانور پیدا ہوتے اور مرتے رہے۔ کئی ہزار سال تک زمین پر صرف

جانور رہے۔ اس کے بعد سمندری پودے نمودار ہوئے اور خشکی پر بھی گھاس اگنا شروع ہوئی۔
اس طرح لمبی مدت تک بے شمار واقعات ظہور میں آتے رہے، یہاں تک کہ انسانی زندگی کے
لئے حالات سازگار ہوئے اور زمین پر انسان پیدا ہوا۔

اس نظریہ کے مطابق انسان کی ابتدا پچھلے تین لاکھ سال سے ہوئی ہے۔ یہ مدت بہت
ہی کم ہے۔ وقت کے جو فاصلے کائنات نے طے کئے ہیں ان کے مقابلہ میں انسانی تاریخ چشم
زدن سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ پھر اگر انسانیت کی اکائی کو لیجئے تو معلوم ہوگا کہ ایک
انسان کی عمر کا اوسط سو سال سے بھی کم ہے۔ ایک طرف اس واقعہ کو سامنے رکھئے اور پھر اس
حقیقت پر غور کیجئے کہ کائنات میں انسان سے بہتر کوئی وجود معلوم نہیں کیا جا سکا ہے۔ زمین
و آسمان کی اربوں اور کھربوں سال کی گردش کے بعد جو بہترین مخلوق اس کائنات کے اندر
وجود میں آئی ہے وہ انسان ہے۔ مگر یہ حیرت انگیز انسان جو ساری دنیا پر فوقیت رکھتا ہے،
جو تمام موجودات میں سب سے افضل ہے اس کی زندگی چند سال سے زیادہ نہیں۔ ہمارا
وجود جن مادی اجزار سے مرکب ہے ان کی عمر تو اربوں اور کھربوں سال ہو اور وہ ہمارے
مرنے کے بعد بھی باقی رہ جائیں مگر ان مادی اجزار کی یکجائی سے جو اعلیٰ ترین وجود بنتا ہے
وہ صرف سو برس زندہ رہے۔ جو کائنات کا حاصل ہے وہ کائنات سے بھی کم عمر رکھتا ہے
تاریخ کے طویل ترین دور میں بے شمار واقعات کیا صرف اس لئے جمع ہوئے تھے کہ
ایک انسان کو چند دنوں کے لئے پیدا کر کے ختم ہو جائیں۔

زمین پر آج جتنے انسان پائے جاتے ہیں اگر ان میں کا ہر آدمی چھ فٹ لمبا، ڈھائی
فٹ چوڑا اور ایک فٹ موٹا ہو تو اس پوری آبادی کو بہ آسانی ایک ایسے صندوق میں بند
کیا جا سکتا ہے جو طول و عرض اور بلندی میں ایک میل ہو۔ بات کچھ عجیب سی معلوم ہوتی
ہے مگر حقیقت یہی ہے۔ پھر اگر اس صندوق کو کسی سمندر کے کنارے لے جا کر ایک ہلکا
سا دھکا دے دیں تو یہ صندوق پانی کی گہرائی میں جا گرے گا۔ صدیاں گزر جائیں گی، نسل
انسانی اپنے کفن میں لپٹی ہوئی ہمیشہ کے لئے پڑی رہے گی، دنیا کے ذہن سے یہ بھی محو
ہو جائے گا کہ یہاں کبھی انسان کی قسم کی کوئی نسل آباد تھی۔ سمندر کی سطح پر اسی طرح
بدستور طوفان آتے رہیں گے، سورج اسی طرح چمکتا رہے گا، کرۂ ارض اپنے محور پر بدستور
چکر کرتا رہے گا، کائنات کی لامحدود پہنائیوں میں پھیلی ہوئی بے شمار دنیائیں اتنے بڑے

حادثہ کو ایک معمولی واقعہ سے زیادہ اہمیت نہ دیں گی۔ کئی صدیوں کے بعد ایک اونچا سا مٹی کا ڈھیر زبان حال سے بتائے گا کہ یہ نسل انسانی کی قبر ہے جہاں وہ صدیوں پہلے ایک چھوٹے سے صندوق میں دفن کی گئی تھی۔

کیا انسان کی قیمت بس اسی قدر ہے، مادہ کو کوٹیے پیٹیے، جلائیے، کچھ بھی کیجئے، وہ ختم نہیں ہوتا، وہ ہر حال میں اپنے وجود کو باقی رکھتا ہے مگر انسان جو مادہ سے برتر مخلوق ہے کیا اس کے لئے بقا نہیں۔ یہ زندگی جو ساری کائنات کا خلاصہ ہے، کیا وہ اتنی بے حقیقت ہے کہ اتنی آسانی سے اسے ختم کیا جا سکتا ہے۔ کیا انسانی زندگی کا منتہا بس یہی ہے کہ وہ کائنات میں اپنے ننھے سے وطن پر چند دنوں کے لئے پیدا ہو اور پھر فنا ہو کر رہ جائے تمام انسانی علم اور ہماری کامرانیوں کے سارے واقعات ہمارے ساتھ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائیں اور کائنات اس طرح باقی رہ جائے گویا نسل انسانی کی اس کے نزدیک کوئی حقیقت ہی نہیں تھی۔

اس سلسلہ میں دوسری چیز جو صریح طور پر محسوس ہوتی ہے وہ یہ کہ اگر زندگی بس اسی دنیا کی زندگی ہے تو یہ ایک ایسی زندگی ہے جس میں ہماری امنگوں کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ ہر انسان لامحدود مدت تک زندہ رہنا چاہتا ہے، کسی کو بھی موت پسند نہیں، مگر اس دنیا میں ہر پیدا ہونے والا جانتا ہے کہ وہ ایسی زندگی سے محروم ہے۔ آدمی خوشی حاصل کرنا چاہتا ہے، ہر آدمی کی یہ خواہش ہے کہ وہ دکھ درد اور ہر قسم کی تکلیفوں سے محفوظ رہ کر زندگی گزارے، مگر حقیقی معنوں میں کیا کوئی شخص بھی ایسی زندگی حاصل کر سکتا ہے۔

ہر آدمی یہ چاہتا ہے کہ اس کو اپنے حوصلوں کی تکمیل کا آخری حد تک موقع ملے، وہ اپنی ساری تمناؤں کو عمل کی صورت میں دیکھنا چاہتا ہے مگر اس محدود دنیا میں وہ ایسا نہیں کر سکتا۔ ہم جو کچھ چاہتے ہیں، یہ کائنات اس کے لئے بالکل ناسازگار معلوم ہوتی ہے وہ ہر چند قدم کے بعد ہمارا راستہ روک کر کھڑی ہو جاتی ہے، کائنات صرف ایک حد تک ہمارا ساتھ دیتی ہے، اس کے بعد ہم کو مایوس اور ناکام لوٹا دیتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا انسانی زندگی محض غلطی سے ایک ایسی کائنات میں بھٹک آئی ہے جو دراصل اس کے لئے نہیں بنائی گئی تھی اور جو بظاہر زندگی اور اس کے متعلقات سے بالکل بے پروا ہے۔ کیا ہمارے تمام جذبات و خیالات اور ہماری تمام

خواہشیں غیر حقیقی ہیں جن کا واقعی دنیا سے کوئی تعلق نہیں۔ ہمارے تمام بہترین تخیلات کائنات کے راستے سے ہٹے ہوئے ہیں اور ہمارے ذہنوں میں بالکل الل ٹپ طریقے سے پیدا ہو گئے ہیں۔ وہ تمام احساسات جن کو لے کر انسانی نسل پچھلے ہزاروں سال سے پیدا ہو رہی ہے اور جن کو اپنے سینہ میں لئے ہوئے وہ اس حال میں دفن ہو جاتی ہے کہ وہ انھیں حاصل نہ کر سکی، کیا ان احساسات کی کوئی منزل نہیں۔ کیا وہ انسانوں کے ذہن میں بس یونہی پیدا ہو رہے ہیں جن کے لئے نہ تو ماضی میں کوئی بنیاد موجود ہے اور نہ مستقبل میں ان کا کوئی مقام ہے۔

ساری کائنات میں صرف انسان ایک ایسا وجود ہے جو کل (Tomorrow) کا تصور رکھتا ہے۔ یہ صرف انسان کی خصوصیت ہے کہ وہ مستقبل کے بارہ میں سوچتا ہے اور اپنے آیندہ حالات کو بہتر بنانا چاہتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض جانور مثلاً چیونٹیاں خوراک جمع کرتی ہیں یا بیا گھونسلے بناتا ہے۔ مگر ان کا یہ عمل غیر شعوری طور پر محض عادتاً ہوتا ہے۔ ان کی عقل اس کا فیصلہ نہیں کرتی کہ انھیں خوراک جمع کر کے رکھنا چاہئے تاکہ کل ان کے کام آسکے یا ایسا گھر بنانا چاہئے جو موسموں کے ردوبدل میں تکلیف سے بچائے۔ انسان اور دوسری مخلوقات کا یہ فرق ظاہر کرتا ہے کہ انسان کو تمام دوسری چیزوں سے زیادہ موقع ملنا چاہئے، جانوروں کے لئے زندگی صرف آج کی زندگی ہے، وہ زندگی کا کوئی کل نہیں رکھتے، کیا اسی طرح انسانی زندگی کا بھی کوئی کل نہیں ہے۔ ایسا ہونا فطرت کے خلاف ہے، فردا کا تصور جو انسان میں پایا جاتا ہے اس کا صریح تقاضا ہے کہ انسان کی زندگی اس سے کہیں زیادہ بڑی ہو جتنی آج اسے حاصل ہے انسان "کل" چاہتا ہے مگر اس کو صرف "آج" دیا گیا ہے!

اسی طرح جب ہم سماجی زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم کو ایک خلا کا زبردست احساس ہوتا ہے۔ ایک طرف مادی دنیا ہے جو اپنی جگہ پر بالکل مکمل نظر آتی ہے۔ وہ ایک متعین قانون میں جکڑی ہوئی ہے اور اس کی ہر چیز اپنے مقرر راستہ پر چلی جا رہی ہے۔ دوسرے لفظوں میں مادی دنیا ویسی ہی ہے جیسی کہ اسے ہونا چاہئے مگر انسانی دنیا کا حال اس سے مختلف ہے۔ یہاں صورتِ حال اس کے برعکس ہے جیسا کہ اسے ہونا چاہئے تھا۔

ہم صریح طور پر دیکھتے ہیں کہ ایک انسان دوسرے انسان پر ظلم کرتا ہے اور دونوں اس حال میں مرجاتے ہیں کہ ایک ظالم ہوتا ہے اور دوسرا مظلوم۔ کیا ظالم کو اس کے ظلم کی سزا اور مظلوم کو اس کی مظلومیت کا بدلہ دیئے بغیر دونوں کی زندگی کو مکمل کہا جا سکتا ہے۔

ایک شخص سچ بولتا ہے اور حق داروں کو ان کے حقوق ادا کرتا ہے جس کے نتیجہ میں اس کی زندگی مشکل کی زندگی بن جاتی ہے، دوسرا شخص جھوٹ اور فریب سے کام لیتا ہے اور جس کی جو چیز پاتا ہے ہڑپ کر لیتا ہے جس کے نتیجہ میں اس کی زندگی نہایت عیش و عشرت کی زندگی بن جاتی ہے۔ اگر یہ دنیا اسی حال میں ختم ہو جائے تو کیا دونوں انسانوں کے اس مختلف انجام کی کوئی توجیہ کی جا سکتی ہے۔ ایک قوم دوسری قوم پر ڈاکہ ڈالتی ہے اور اس کے وسائل و ذرائع پر قبضہ کر لیتی ہے مگر اس کے باوجود دنیا میں وہی نیک نام رہتی ہے کیونکہ اس کے پاس نشر و اشاعت کے ذرائع ہیں اور دبی ہوئی قوم کی حالت سے دنیا ناواقف رہتی ہے کیونکہ اس کی آہ کے دنیا کے کانوں تک پہونچنے کا کوئی ذریعہ نہیں، کیا ان دونوں کی صحیح حیثیت کبھی ظاہر نہیں ہوگی۔ دو اشخاص یا دو قوموں میں ایک مسئلہ پر اختلاف ہوتا ہے اور زبردست کش مکش تک نوبت پہونچ جاتی ہے۔ دونوں اپنے آپ کو برسرحق کہتے ہیں اور ایک دوسرے کو انتہائی برا ثابت کرتے ہیں مگر دنیا میں ان کے مقدمہ کا فیصلہ نہیں ہوتا، کیا ایسی کوئی عدالت نہیں ہے جو ان کے درمیان ٹھیک ٹھیک فیصلہ کر سکے۔

موجودہ دور کو ایٹمی دور کہا جاتا ہے لیکن اگر اس کو خودسری کا دور کہیں تو زیادہ صحیح ہوگا۔ آج کا انسان صرف اپنی رائے اور خواہش پر چلنا چاہتا ہے خواہ اس کی رائے اور خواہش کتنی ہی غلط کیوں نہ ہو۔ ہر شخص غلط کار ہے مگر ہر شخص گلے کی پوری قوت کے ساتھ اپنے کو صحیح ثابت کر رہا ہے۔ اخبارات میں لیڈروں اور حکمرانوں کے بیانات دیکھئے، ہر ایک انتہائی دیدہ دلیری کے ساتھ اپنے ظلم کو عین انصاف اور اپنی غلط کاریوں کو عین حق ثابت کرتا ہوا نظر آئے گا۔ کیا اس فریب کا پردہ کبھی چاک ہونے والا نہیں ہے۔

یہ صورت حال صریح طور پر ظاہر کر رہی ہے کہ یہ دنیا نامکمل ہے۔ اس کی تکمیل کے لئے ایک ایسی دنیا چاہئے جہاں ہر ایک کو اس کا صحیح مقام مل سکے۔

مادی دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ جہاں کوئی خلا ہے اس کو پُر کرنے کے اسباب موجود ہیں۔ مادی دنیا میں کہیں کوئی کمی نظر نہیں آتی۔ اس کے برعکس انسانی دنیا میں ایک زبردست خلا ہے۔ جس قدرت نے مادّی دنیا کو مکمل حالت میں ترقی دی ہے کیا اس کے پاس انسانی دنیا کا خلا پر کرنے کا کوئی سامان نہیں۔ ہمارا احساس بعض افعال کو اچھا اور بعض کو برا سمجھتا ہے۔ ہم کچھ باتوں کے متعلق چاہتے ہیں کہ وہ ہوں اور کچھ باتوں کو چاہتے ہیں کہ وہ نہ ہوں۔ مگر ہماری فطری خواہش کے علی الرّغم وہ سب کچھ یہاں ہو رہا ہے جس کو انسانی فطرت برا سمجھتی ہے، انسان کے اندر اس طرح کے احساس کی موجودگی یہ معنی رکھتی ہے کہ کائنات کی تعبیر حق پر ہوئی ہے۔ یہاں باطل کے بجائے حق کو غالب آنا چاہئے۔ پھر کیا حق ظاہر نہیں ہوگا۔ جو چیز مادی دنیا میں پوری ہو رہی ہے کیا وہ انسانی دنیا میں پوری نہیں ہوگی۔

یہی وہ سوالات ہیں جن کے مجموعہ کو میں نے اوپر "انسانیت کے انجام کی تلاش" کہا ہے۔ ایک شخص جب ان حالات کو دیکھتا ہے تو وہ سخت بے چینی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس کے اندر نہایت شدت سے یہ احساس ابھرتا ہے کہ زندگی اگر یہی ہے جو اس وقت نظر آرہی ہے تو یہ کس قدر لغو زندگی ہے۔ وہ ایک طرف دیکھتا ہے کہ انسانی زندگی کے لئے کائنات میں اس قدر اہتمام کیا گیا ہے گویا سب کچھ صرف اسی کے لئے ہے، دوسری طرف انسان کی زندگی اس قدر مختصر اور اتنی ناکام ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کو کس لئے پیدا کیا گیا ہے۔

اس سوال کے سلسلہ میں آج لوگوں کا رجحان عام طور پر یہ ہے کہ اس قسم کے جھنجھٹ میں پڑنا فضول ہے۔ یہ سب فلسفیانہ سوالات ہیں، اور حقیقت پسندی یہ ہے کہ زندگی کا جو لمحہ تمہیں حاصل ہے اس کو پر مسرت بنانے کی کوشش کرو۔ آیندہ کیا ہوگا یا جو کچھ ہو رہا ہے وہ صحیح ہے یا غلط، اس کی فکر میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔

اس جواب کے بارہ میں کم از کم بات جو کہی جاسکتی ہے وہ یہ کہ جو لوگ اس انداز میں سوچتے ہیں انھوں نے ابھی انسانیت کے مقام کو نہیں پہچانا، وہ مجاز کو حقیقت سمجھ لینا چاہتے ہیں۔ واقعات انھیں ابدی زندگی کا راز معلوم کرنے کی دعوت دے رہے ہیں مگر وہ چند روزہ زندگی پر قانع ہو گئے ہیں۔ انسانی نفسیات کا تقاضا ہے

کہ اپنی امنگوں اور حوصلوں کی تکمیل کے لئے ایک وسیع تر دنیا کی تلاش کرو مگر یہ نادان روشنی کے بجائے اس کے سایہ کو کافی سمجھ رہے ہیں۔ کائنات پکار رہی ہے کہ یہ دنیا تمہارے لئے نامکمل ہے، دوسری مکمل دنیا کا کھوج لگاؤ۔ مگر ہمارا فیصلہ ہے کہ ہم اسی نامکمل دنیا میں اپنی زندگی کی عمارت تعمیر کریں گے، ہم کو مکمل دنیا کی ضرورت نہیں۔ حالات کا صریح اشارہ ہے کہ زندگی کا ایک انجام آنا چاہئے، مگر یہ لوگ صرف آغاز کو لے کر بیٹھ گئے ہیں اور انجام کی طرف سے آنکھیں بند کر لی ہیں۔ حالانکہ یہ اسی قسم کی ایک حماقت ہے جو شتر مرغ کے متعلق مشہور ہے۔ اگر فی الواقع زندگی کا کوئی انجام ہے تو وہ آکر رہے گا اور کسی کا اس سے غافل ہونا اس کو روکنے کا سبب نہیں بن سکتا۔ البتہ ایسے لوگوں کے حق میں وہ ناکامی کا فیصلہ ضرور کر سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ زندگی کو کل زندگی سمجھنا اور صرف آج کو پر مسرت بنانے کی کوشش کو اپنا مقصد بنا لینا بڑی کم ہمتی اور بے عقلی کی بات ہے۔ آدمی اگر اپنی زندگی اور کائنات پر تھوڑا سا بھی غور کرے تو اس نقطۂ نظر کی لغویت فوراً واضح ہو جاتی ہے ایسا فیصلہ وہی کر سکتا ہے جو حقیقتوں کی طرف سے آنکھیں بند کر لے اور بالکل بے سمجھی بوجھی زندگی گزارنا شروع کر دے۔

یہ ہیں وہ چند سوالات جو کائنات کو دیکھتے ہی نہایت شدت کے ساتھ ہمارے ذہن میں ابھرتے ہیں۔ اس کائنات کا ایک خالق ہونا چاہئے، مگر اس کے متعلق ہمیں کچھ نہیں معلوم۔ اس کا ایک چلانے والا اور اس کو سنبھالنے والا ہونا چاہئے، مگر ہم نہیں جانتے کہ وہ کون ہے۔ ہم کسی کے احسانات سے ڈھکے ہوئے ہیں اور مجسم شکر و سپاس بن کر اس ہستی کو ڈھونڈھنا چاہتے ہیں جس کے آگے اپنے عقیدت کے جذبات کو نثار کر سکیں، مگر ایسا کوئی وجود ہمیں نظر نہیں آتا۔ ہم اس کائنات کے اندر انتہائی عجز اور بے بسی کے عالم میں ہیں، ہم کو ایک ایسی پناہ کی تلاش ہے جہاں پہونچ کر ہم اپنے آپ کو محفوظ تصور کر سکیں، مگر ایسی کوئی پناہ ہماری آنکھوں کے سامنے موجود نہیں ہے۔ پھر جب ہم اپنی زندگی اور اپنی عمر کو دیکھتے ہیں تو کائنات کا یہ تضاد ہم کو ناقابل فہم معلوم ہوتا ہے کہ کائنات کی عمر تو کھربوں سال ہو اور انسان جو کائنات کا خلاصہ ہے اس کی عمر

صرف چند سال۔ فطرت ہم کو بے شمار امنگوں اور حوصلوں سے معمور کرے مگر دنیا کے اندر اس کی تسکین کا سامان فراہم نہ کرے۔

پھر سب سے زیادہ سنگین تضاد وہ ہے جو مادی دنیا اور انسانی دنیا میں پایا جاتا ہے۔ مادی دنیا انتہائی طور پر مکمل ہے، اس میں کہیں خلا نظر نہیں آتا، مگر انسانی زندگی میں زبردست خلا ہے۔ اشرف المخلوقات کی حالت ساری مخلوق سے بدتر نظر آتی ہے۔ ہماری بدقسمتی کی انتہا یہ ہے کہ اگر پٹرول کا کوئی نیا چشمہ دریافت ہو یا بھیڑ بکریوں کی نسل بڑھے تو اس سے انسان خوش ہوتا ہے، مگر انسانی نسل کا اضافہ ہمارے لئے گوارہ نہیں۔ ہم اپنی مشکلوں سے اس قدر پریشان ہیں کہ انسان کی پیدائش کو روک دینا چاہتے ہیں۔

انسان کی نارسائی

یہ سوالات ہم کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں، وہ اندر سے بھی ابل رہے ہیں اور باہر سے بھی ہمیں گھیرے ہوئے ہیں، مگر ہمیں نہیں معلوم کہ ان کا جواب کیا ہے۔ یہ زندگی کی حقیقت معلوم کرنے کا سوال ہے، مگر کس قدر عجیب بات ہے کہ ہمیں زندگی تو مل گئی مگر اس کی حقیقت ہمیں نہیں بتائی گئی۔

اس حقیقت کی دریافت کے لئے جب ہم اپنی عقل اور اپنے تجربات کی طرف دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا صحیح اور قطعی جواب معلوم کرنا ہماری عقل اور ہمارے تجربہ کے بس سے باہر ہے۔ اس سلسلہ میں اب تک ہم نے جو رائیں قائم کی ہیں وہ اٹکل سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتیں۔ جس طرح ہماری نظر کا دائرہ محدود ہے اور ہم ایک مخصوص جسامت سے چھوٹی چیز کا مشاہدہ نہیں کر سکتے اور ایک مخصوص فاصلے سے آگے کے اجسام کو نہیں دیکھ سکتے، اسی طرح کائنات کے متعلق ہمارا علم بھی ایک تنگ دائرہ میں محدود ہے جس کے آگے یا پیچھے کی ہمیں کوئی خبر نہیں۔ ہمارا علم نامکمل ہے، ہمارے حواس خمسہ ناقص ہیں۔ ہم حقیقت کو نہیں دیکھ سکتے۔ میدہ اور کالک کو اگر ملایا جائے تو بھورے خاکستری رنگ کا ایک سفوف سا بن جاتا ہے، لیکن اس سفوف کا باریک کیڑا جو سفوف کے ذروں ہی کے برابر ہوتا ہے اور صرف خوردبین کی مدد سے دیکھا جا سکتا ہے وہ اس کو کچھ سیاہ اور کچھ سفید رنگ کی چٹان سمجھتا ہے

اس کے مشاہدہ کے پیمانہ میں خاکستری سفوف کوئی چیز نہیں۔
نوعِ انسانی کی زندگی اس زمانہ کے مقابلہ میں جب کہ یہ کرۂ ارض وجود میں آیا اس قدر مختصر ہے کہ کسی شمار میں نہیں آتی، اور خود کرۂ ارض کائنات کے اتھاہ سمندر میں ایک قطرہ کے برابر بھی نہیں۔ ایسی صورت میں انسان کائنات کی حقیقت کے بارہ میں جو خیال آرائی کرتا ہے، اس کو اندھیرے میں ٹٹولنے سے زیادہ اور کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ ہماری انتہائی لاعلمی فوراً ظاہر ہو جاتی ہے جب ہم کائنات کی وسعت کا تصور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اگر آپ اس بات کو سامنے رکھیں کہ آفتاب اسیؔ کھرب سال سے موجود ہے اس زمین کی عمر جس پر ہم بستے ہیں دو ارب سال ہے، اور زمین پر زندگی کے آثار نمایاں ہوئے تین کرور سال گذر چکے ہیں مگر اس کے مقابلہ میں زمین پر ذی عقل انسان کی تاریخ چند ہزار سال سے زیادہ نہیں تو یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ چند ہزار سال کا زمانہ جس میں انسان نے اپنی معلومات فراہم کی ہیں، اس طویل زمانہ کا ایک بہت حقیر جزء ہے جو کہ دراصل کائنات کے اسرار کو معلوم کرنے کے لئے درکار ہے۔ کائنات کے بے حد طویل ماضی اور نامعلوم مستقبل کے درمیان انسانی زندگی محض ایک لمحہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہمارا وجود ایک نہایت حقیر قسم کا درمیانی وجود ہے جس کے آگے اور پیچھے کی ہمیں کوئی خبر نہیں۔ ہماری عقل کو عاجزی کے ساتھ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اس کائنات کی وسعت لامحدود ہے اور اس کو سمجھنے کے لئے ہماری عقل اور ہمارا تجربہ بالکل ناکافی ہیں ہم اپنی محدود صلاحیتوں کے ذریعہ کبھی بھی اس کو سمجھ نہیں سکتے۔ اب تک کی کوششوں کی ناکامی اس کو ثابت کرنے کے لئے بالکل کافی ہے

اس طرح ہمارا علم اور ہمارا مطالعہ ہم کو ایک ایسے مقام پر لاکر چھوڑ دیتے ہیں۔ جہاں ہمارے سامنے بہت سے سوالات ہیں، ایسے سوالات جو لازمی طور پر اپنا جواب چاہتے ہیں۔ جن کے بغیر انسانی زندگی بالکل لغو اور بے کار نظر آتی ہے۔ مگر جب ہم ان پر سوچنے بیٹھتے ہیں تو ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ ہم اپنے ذہن سے ان کا جواب معلوم نہیں کر سکتے۔ ہم کو وہ آنکھ ہی نہیں ملی جس سے حقیقت کا مشاہدہ کیا جاسکے۔ اور وہ ذہن ہمیں حاصل نہیں ہے جو براہ راست حقیقت کا ادراک کر سکے۔

پیغمبر کی ضرورت

اس موقع پر ایک شخص ہمارے سامنے آتا ہے اور کہتا ہے کہ جس حقیقت کو تم معلوم کرنا چاہتے ہو، اس کا علم مجھے دیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ:

"اس کائنات کا ایک خدا ہے جس نے سارے عالم کو بنایا ہے، اور اپنی غیر معمولی قوتوں کے ذریعہ اس کا انتظام کر رہا ہے۔ جو چیزیں تمہیں حاصل ہیں وہ سب اسی نے تمہیں دی ہیں اور سارے معاملات کا اختیار اسی کو ہے۔ یہ جو تم دیکھ رہے ہو کہ مادی دنیا کے اندر کوئی تضاد نہیں، وہ ٹھیک ٹھیک اپنے فرائض انجام دے رہی ہے اور اس کے برعکس انسانی دنیا ادھوری نظر آتی ہے، یہاں زبردست خلفشار برپا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کو آزادی دے کر اسے آزمایا جا رہا ہے۔ تمہارا مالک یہ چاہتا ہے کہ اس کا قانون جو مادی دنیا میں براہ راست نافذ ہو رہا ہے اس کو انسان اپنی زندگی میں خود سے اختیار کرے یہی وجود کائنات کا خالق ہے، وہی اس کا مدبر اور منتظم ہے، وہی تمہارے جذباتِ شکر کا مستحق ہے اور وہی ہے جو تم کو پناہ دے سکتا ہے۔ اِس نے تمہارے لئے ایک لامحدود زندگی کا انتظام کر رکھا ہے جو موت کے بعد آنے والی ہے، جہاں تمہاری امنگوں کی تسکین ہو سکے گی، جہاں حق و باطل الگ الگ کر دیئے جائیں گے اور نیکوں کو ان کی نیکی کا اور بروں کو ان کی برائی کا بدلہ دیا جائے گا۔ اس نے میرے ذریعہ سے تمہارے پاس اپنی کتاب بھیجی ہے جس کا نام قرآن ہے۔ جو اس کو مانے گا وہ کامیاب ہوگا اور جو اس کو نہ مانے گا ذلیل کر دیا جائے گا۔"

یہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی آواز ہے جو چودہ سو برس پہلے عرب کے ریگستان سے بلند ہوئی تھی اور آج بھی ہم کو پکار رہی ہے۔ اس کا پیغام ہے کہ اگر حقیقت کو معلوم کرنا چاہتے ہو تو میری آواز پر کان لگاؤ اور میں جو کچھ کہتا ہوں اس پر غور کرو۔

کیا یہ آواز حقیقت کی واقعی تعبیر ہے، کیا ہمیں اس پر ایمان لانا چاہئے۔ وہ کون سی بنیادیں ہیں جن کی روشنی میں اس کے صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ کیا جائے گا۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس حقیقت کو وہ اس وقت تسلیم کریں گے جب کہ وہ انھیں نظر آئے۔ وہ حقیقت کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتے ہیں۔ مگر یہ مطالبہ

بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص فلکیات کا مطالعہ ریاضی کے بغیر کرنے کی کوشش کرے اور کہے کہ وہ فلکیاتی سائنس کی صرف ان ہی دریافتوں کو تسلیم کرے گا جو کھلی آنکھوں سے اسے نظر آتی ہوں، ریاضیات کی دلیل اس کے نزدیک قابل قبول نہیں ہے، یہ مطالبہ ظاہر کرتا ہے کہ آدمی کو اپنی قوتوں کا صحیح علم نہیں ہے۔

انسان کے پاس مشاہدہ کی جو قوتیں ہیں وہ نہایت محدود ہیں، حقیقت ہمارے لئے ایک ناقابل مشاہدہ چیز ہے۔ ہم اسے محسوس تو کر سکتے ہیں مگر اسے دیکھ نہیں سکتے۔ ایک زمانہ میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ دنیا چار چیزوں سے مل کر بنی ہے۔ "آتش و آب و خاک و باد"۔ دوسرے لفظوں میں قدیم انسان اس غلط فہمی میں مبتلا تھا کہ حقیقت ایک ایسی چیز ہے جسے دیکھا جا سکتا ہے، مگر جدید تحقیقات نے اس کی غلطی واضح کر دی ہے۔ اب ہم جانتے ہیں کہ دنیا کی تمام چیزیں اپنے آخری تجزیہ میں ایٹم کے باریک ترین ذرات پر مشتمل ہیں۔ ایٹم ایک اوسط درجہ کے سیب سے اتنا ہی چھوٹا ہوتا ہے جتنا کہ سیب ہماری زمین سے۔ یہ ایٹم ایک طرح کا نظام شمسی ہے جس کا ایک مرکز ہے، اس مرکز میں پروٹان اور نیوٹران ہوتے ہیں اور اس کے چاروں طرف الکٹران (برقیے) مختلف مداروں میں اسی طرح حرکت کرتے ہیں جیسے سورج کے گرد اس کے تابع سیارے حرکت کرتے ہیں۔ ایک برقیہ جس کا قطر سینٹی میٹر کا پانچ ہزار کروڑواں حصہ ہو اور جو اپنے مرکز کے چاروں طرف ایک سکنڈ میں کروڑوں مرتبہ چکر کاٹتا ہو اس کے تصور کی کوشش کرنا سعی لاحاصل ہے۔ جب کہ ہمیں یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ اندرونی عالموں کی آخری حد ہے۔ ممکن ہے ان عالموں کے اندر ان سے بھی چھوٹے عالم ہوں۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہماری مشاہدہ کی قوت کس قدر کمزور ہے، پھر سوال یہ ہے کہ پروٹان اور نیوٹران کے وہ انتہائی چھوٹے ذرے جو باہم مل کر مرکز بناتے ہیں وہ کس طرح قائم ہیں۔ آخر یہ پروٹان اور نیوٹران مرکز سے باہر کیوں نہیں نکل پڑتے۔ وہ کیا چیز ہے جو انھیں ایک دوسرے سے باندھے ہوئے ہے۔ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ ان مادی ذرات کے درمیان ایک توانائی موجود ہے اور یہی توانائی مرکز کے برقی اور غیر برقی ذرات کو آپس میں جکڑے ہوئے ہے۔ اس کو طاقت یکجائی

(Binding Energy) کا نام دیا گیا ہے۔ گویا مادہ اپنے آخری تجزیہ میں توانائی ہے، میں پوچھتا ہوں، کیا یہ توانائی قابل مشاہدہ چیز ہے۔ کیا کسی بھی خوردبین کے ذریعہ اسے دیکھا جا سکتا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جدید سائنس نے خود یہ تسلیم کر لیا ہے کہ حقیقت اپنی آخری صورت میں ایک ناقابل مشاہدہ چیز ہے اس کو انسانی آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔

اب اگر رسول کی بات کو ماننے کے لئے ہم یہ شرط لگائیں کہ وہ جن حقیقتوں کی خبر دے رہا ہے وہ ہمیں چھونے اور دیکھنے کو ملنی چاہئیں تب ہم اسے مانیں گے تو یہ ایک نہایت نامعقول بات ہوگی۔ یہ ایسی ہی بات ہوگی جیسے تاریخ ہند کا کوئی طالب علم ایسٹ انڈیا کمپنی کے حالات کا مطالعہ کرتے ہوئے اپنے استاد سے کہے کہ کمپنی کے تمام کردار کو میرے سامنے لاکر کھڑا کر دو اور وہ میرے سامنے تمام گزرے ہوئے واقعات کو دہرائیں، تب میں تمہاری تاریخ کو تسلیم کروں گا۔

پھر وہ کون سی بنیادیں ہیں جن کی روشنی میں دیکھ کر ہم یہ فیصلہ کریں کہ یہ دعوت صحیح ہے یا غلط، اور ہم کو اسے قبول کرنا چاہئے یا نہیں۔ میرے نزدیک اس دعوت کو جانچنے کے تین خاص پہلو ہیں۔ اول یہ کہ اس کی توجیہ حقیقت سے کتنی مطابقت رکھتی ہے۔ دوسرے یہ کہ زندگی کے انجام کے بارہ میں اس کا دعویٰ محض دعویٰ ہے یا اس کی کوئی دلیل بھی اس کے یہاں ملتی ہے۔ اور تیسرے یہ کہ اس کے پیش کئے ہوئے کلام میں کیا ایسی کوئی نمایاں خصوصیت پائی جا رہی ہے کہ اس کو خدا کا کلام کہا جا سکے۔ ان تینوں پہلوؤں کے اعتبار سے جب ہم رسول کے کام کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک پر وہ نہایت کامیابی کے ساتھ پورا اتر رہا ہے۔

۱۔ رسول نے کائنات کی جو توجیہ کی ہے اس میں ہماری تمام پیچیدگیوں کا حل موجود ہے۔ ہمارے اندر اور ہمارے باہر جتنے سوالات پیدا ہوتے ہیں ان سب کا وہ بہترین جواب ہے۔

۲۔ زندگی کے انجام کے بارہ میں اس کا جو دعویٰ ہے اس کے لئے وہ ایک قطعی دلیل بھی اپنے پاس رکھتا ہے۔ وہ یہ کہ موجودہ زندگی میں وہ اس انجام کا

ایک نمونہ ہمیں دکھا دیتا ہے جس کو بعد کی زندگی میں آنے کی وہ خبر دے رہا ہے۔
۳۔ وہ جس کلام کو خدا کا کلام کہتا ہے اس کے اندر اتنی غیر معمولی خصوصیات پائی جاتی ہیں کہ ماننا پڑتا ہے کہ یقیناً یہ ایک فوق الانسانی طاقت کا کلام ہے۔ کسی انسان کا کلام ایسا نہیں ہو سکتا۔
آئیے اب ان تینوں پہلوؤں سے رسول کی دعوت کا جائزہ لیں۔

پیغمبر کی صداقت

۱۔ اس کی پہلی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ انسانی نفسیات کے عین مطابق ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان کی پیدائش جس فطرت پر ہوئی ہے وہی فطرت اس توجیہ کی بھی ہے۔ اس توجیہ کی بنیاد ایک خدا کے وجود پر رکھی گئی ہے، اور ایک خدا کا شعور انسان کی فطرت میں شامل ہے۔ اس کے دو نہایت مضبوط قرینے ہیں۔ ایک یہ کہ انسانی تاریخ کے تمام معلوم زمانوں میں انسانوں کی اکثریت بلکہ تقریباً ان کی تمام تعداد نے خدا کے وجود کو تسلیم کیا ہے۔ انسان پر کبھی بھی ایسا کوئی دور نہیں گزرا ہے جب اس کی اکثریت خدا کے شعور سے خالی رہی ہو۔ قدیم ترین زمانوں سے لے کر آج تک انسانی تاریخ کی متفقہ شہادت یہی ہے کہ خدا کا شعور انسانی فطرت کا نہایت طاقت ور شعور رہے۔ دوسرا قرینہ یہ ہے کہ انسان پر جب کوئی نازک وقت آتا ہے تو اس کا دل بے اختیار خدا کو پکار اٹھتا ہے، جہاں کوئی سہارا نظر نہیں آتا، وہاں وہ خدا کا سہارا ڈھونڈتا ہے۔ جاہل ہو یا عالم۔ خدا پرست ہو یا ملحد، روشن خیال ہو یا تاریک خیال جب بھی اس پر کوئی ایسا وقت گزرتا ہے جہاں عام انسانی قوتیں جواب دیتی ہوئی نظر آتی ہیں تو وہ ایک ایسی ہستی کو پکارتا ہے جو تمام طاقتوں سے بڑھ کر طاقتور ہے اور جو تمام طاقتوں کا خزانہ ہے۔ انسان اپنے نازک ترین لمحات میں خدا کو یاد کرنے پر مجبور رہے۔ اس کی ایک دلچسپ مثال ہمیں سٹالن کی زندگی میں ملتی ہے جس کا ذکر مسٹر چرچل نے دوسری جنگ عظیم کے حالات کے متعلق اپنی کتاب کی چوتھی جلد صفحہ ۴۳۳ میں کیا ہے۔ ۱۹۴۲ء کے نازک حالات میں جب کہ ہٹلر سارے یورپ کے لئے خطرہ بنا ہوا تھا، چرچل نے ماسکو کا

سفر کیا تھا، اس موقع پر چرچل نے سٹالن کو اتحادی فوجی کارروائی کے متعلق اپنی اسکیم کی تفصیلات بتائیں۔ چرچل کا بیان ہے کہ اسکیم کی تشریح کے ایک خاص مرحلہ پر جب کہ سٹالن کی دلچسپیاں اس سے بہت بڑھ چکی تھیں، اس کی زبان سے نکلا خدا اس مہم کو کامیاب کرے"۔

(May God prosper this undertaking)

اسی کے ساتھ نبی کی آواز کی یہ خصوصیت بھی ہے کہ وہ ان تمام سوالات کی مکمل توجیہ ہے جو انسان معلوم کرنا چاہتا ہے اور جو کائنات کے مطالعہ سے ہمارے ذہنوں میں ابھرتے ہیں۔ کائنات کے مطالعہ نے ہمیں اس نتیجہ پر پہونچایا تھا کہ یہ محض اتفاق سے نہیں پیدا ہو سکتی، ضرور اس کا کوئی پیدا کرنے والا ہونا چاہئے۔ اس توجیہ میں اس سوال کا جواب موجود ہے۔ ہم کو نظر آرہا تھا کہ کائنات محض ایک مادی مشین نہیں ہے اس کے پیچھے کوئی غیر معمولی ذہن ہونا چاہئے جو اسے چلا رہا ہو۔ اس توجیہ میں اس سوال کا جواب بھی موجود ہے۔ ہم کو اپنے محسن کی تلاش تھی اور ایک ایسی ہستی کی تلاش تھی جو ہمارا سہارا بن سکے۔ اس توجیہ میں اس کا جواب بھی موجود ہے۔ ہم کو یہ بات بہت عجیب معلوم ہورہی تھی کہ انسانی زندگی اتنی مختصر کیوں ہے۔ ہم اس کو لامحدود دیکھنا چاہتے تھے۔ ہم اپنے لئے ایک ایسے وسیع میدان کی تلاش میں تھے جہاں ہماری امنگوں کی تکمیل ہو سکے۔ اس توجیہ میں اس کا جواب بھی موجود ہے۔ پھر انسانی حالات کا شدید تقاضا تھا کہ حق کا حق ہونا اور باطل کا باطل ہونا واضح ہو اور اچھے اور بُرے الگ الگ کر دئے جائیں، ہر ایک کو اس کا صحیح مقام دیا جائے۔ اس سوال کا جواب بھی اس توجیہ میں موجود ہے۔ غرض زندگی سے متعلق سارے سوالات کا مکمل جواب ہے اور اتنا بہتر جواب ہے کہ اس سے بہتر جواب کا ہم تصور نہیں کر سکتے۔ اس سے وہ سارے سوالات حل ہو جاتے ہیں جو کائنات کے مطالعہ سے ہمارے ذہن میں پیدا ہوئے تھے۔

۲۔ اس کی دعوت کی دوسری نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ زندگی کے انجام کے بارہ میں وہ جو نظریہ پیش کرتا ہے اس کا ایک واقعاتی نمونہ خود اپنی زندگی میں ہمیں دکھا دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ دنیا اسی طرح ظالم اور مظلوم کو لئے ہوئے ختم نہیں ہو جائیگی

بلکہ اس کے انجام پر کائنات کا رب ظاہر ہوگا اور سچوں اور جھوٹوں کو ایک دوسرے سے الگ الگ کر دے گا، اس دن کے آنے میں جو دیر ہے وہ صرف اس مہلتِ کار کے ختم ہونے کی ہے جو تمہارے لئے مقدر ہے۔

یہ بات وہ صرف کہہ کر نہیں چھوڑ دیتا، بلکہ اسی کے ساتھ اس کا دعویٰ یہ بھی ہے کہ میں جو کچھ کہتا ہوں اس کے صحیح ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ اس عدالت کا ایک نمونہ مالک کائنات میرے ذریعہ سے اسی دنیا میں تم کو دکھائے گا۔ میرے ذریعہ سے وہ حق کو غالب اور باطل کو مغلوب کرے گا، اپنے فرماں برداروں کو عزت دے گا اور اپنے نافرمانوں کو ذلیل کر کے انھیں عذاب میں مبتلا کرے گا۔ یہ واقعہ بہر حال ظہور میں آئے گا خواہ دنیا کے لوگ کتنی ہی مخالفت کریں اور ساری طاقت اس کے مٹانے پر لگا دیں جس طرح آخرت کا ہونا قطعی طور پر مقدر ہے اور کوئی اسے روک نہیں سکتا۔ اسی طرح میری زندگی میں اس کا نمونہ دکھایا جانا بھی لازمی ہے، یہ ایک نشان ہوگا آنے والے دن کا اور یہ دلیل ہوگی اس بات کی کہ کائنات کی تعمیر عدل پر ہوئی ہے اور یہ کہ میں جس طاقت کا نمائندہ ہوں وہ ایک ایسی طاقت ہے جس کی طاقت سب پر بالا ہے یہ طاقت ایک روز تم کو اپنے سامنے کھڑا کر کے تمام اگلے پچھلے انسانوں کا فیصلہ کرے گی۔

یہ چیلنج وہ اس وقت دیتا ہے جب کہ وہ تنہا ہے، پوری قوم اس کی دشمن ہوگئی ہے، خود اپنا ملک اس کو جگہ دینے کے لئے تیار نہیں، اس کے قریب ترین اعزا نے بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیا ہے، اس کے پاس مادی وسائل و ذرائع میں سے کچھ بھی نہیں۔ ایسا ایک شخص پورے یقین کے ساتھ اعلان کرتا ہے کہ میں غالب ہوں گا اور میرے ذریعہ سے خدا کی عدالت زمین پر قائم ہوگی۔ سننے والے اس کا مذاق اڑاتے ہیں مگر وہ نہایت سنجیدگی کے ساتھ اپنا کام کرتا چلا جا رہا ہے ملک کی اکثریت اس کے قتل کا فیصلہ کرتی ہے، اس کی معاشیات تباہ کر دیتی ہے، اس کو جلا وطنی پر مجبور کرتی ہے۔ اس کو مٹانے پر اپنا سارا زور صرف کر دیتی ہے، مگر اس کے مقابلہ میں یہ سب کچھ بے اثر ثابت ہوتا ہے۔ اگرچہ بہت تھوڑے لوگ اس کا ساتھ دیتے ہیں، ایک طرف معمولی اقلیت ہوتی ہے اور دوسری طرف زبردست

اکثریت۔ ایک طرف ساز و سامان ہوتا ہے اور دوسری طرف بے سرو سامانی۔ ایک طرف ملکی باشندوں اور ہمسایہ قوموں کی حمایت ہوتی ہے اور دوسری طرف اپنوں اور غیروں کی متفقہ مخالفت۔ حالات کی انتہائی ناسازگاری سے اس کے ساتھی اکثر گھبرا اٹھتے ہیں مگر وہ ہر بار یہی کہتا ہے کہ انتظار کرو خدا کا فیصلہ آکر رہے گا، اس کو کوئی طاقت روک نہیں سکتی۔

اس کے چیلنج پر چوتھائی صدی بھی گزرنے نہیں پاتی کہ وہ مکمل شکل میں پورا ہو جاتا ہے اور تاریخ میں اپنی نوعیت کا واحد واقعہ ظہور میں آتا ہے کہ ایک شخص نے جن دعووں کے ساتھ اپنے کام کا آغاز کیا تھا ٹھیک اسی شکل میں اس کا دعویٰ پورا ہوا اور اس کے مخالفین اس میں کوئی کمی بیشی نہ کر سکے۔ حق اور باطل الگ الگ ہو گیا۔ خدا کے فرماں برداروں کو عزت اور غلبہ حاصل ہوا، اور خدا کے نافرمانوں کا زور لوڑ کر انھیں محکوم بنا دیا گیا۔

اس طرح اس دعوت نے انسانوں کے لئے جس انجام کی خبر دی تھی اس کا ایک نمونہ دنیا میں قائم کر دیا گیا جو قیامت تک کے لئے عبرت کا نشان ہے، اس نمونہ کی تکمیل آخرت میں ہو گی جب سارے انسانوں کو خدا کی عدالت میں حاضر کر کے ان کا آخری فیصلہ کیا جائے گا۔

۳۔ اس شخص کے دعوے کے برحق ہونے کا تیسرا ثبوت وہ کلام ہے جس کو وہ کلام الٰہی کہہ کر پیش کرتا ہے۔ اس کلام کے اوپر کتنی ہی صدیاں گزر چکی ہیں مگر اس کی عظمت، اس کی سچائی اور حقیقت کے بارہ میں اس کے بیان کا ایک حرف بھی غلط ثابت نہ ہو سکا جب کہ کوئی بھی انسانی کتاب ایسی نہیں ہے جو ان نقائص سے پاک ہو۔

دوسرے لفظوں میں قرآن بذات خود اس بات کی دلیل ہے کہ وہ خدا کی کتاب ہے، اس کے بہت سے پہلو ہیں مگر میں یہاں صرف تین پہلوؤں کا ذکر کروں گا، ایک اس کا غیر معمولی انداز بیان، دوسرے اس کے معانی کا تضاد سے پاک ہونا، تیسرے اس کی ابدیت۔

قرآن اپنی دلیل آپ

۱۔ قرآن ایک غیر معمولی کلام ہے۔ اس کو پڑھتے ہوئے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مصنف ایک ایسے بلند مقام سے بول رہا ہے جو کسی بھی انسان کو حاصل نہیں۔ اس کی عبارتوں کا شکوہ، اس کی بے پناہ روانی اور اس کا فیصلہ کن انداز بیان اتنا حیرت انگیز طور پر انسانی کلام سے مختلف ہے کہ صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ مالک کائنات کی آواز ہے کسی انسان کی آواز نہیں۔ اس کا پر یقین اور باعظمت کلام خود ہی بول رہا ہے کہ یہ خدا کی کتاب ہے جس میں خدا اپنے بندوں سے مخاطب ہوا ہے۔ قرآن میں کائنات کی حقیقت بتائی گئی ہے۔ انسان کے انجام کی خبر دی گئی ہے اور زندگی سے متعلق تمام کھلے اور چھپے حالات پر گفتگو کی گئی ہے۔ مگر یہ سب کچھ اس قدر قطعی انداز میں بیان ہوا ہے کہ واقعہ کا اظہار واقعہ کا مشاہدہ معلوم ہونے لگتا ہے۔ قرآن کو پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے گویا آدمی کو حقیقت کا علم نہیں دیا جا رہا ہے بلکہ اس کو حقیقت کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا گیا ہے۔ وہ واقعہ کو کتاب کے صفحات میں نہیں پڑھ رہا ہے بلکہ اسکرین کے اوپر اس کو اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ کلام کی یہ قطعیت صاف ظاہر کر رہی ہے کہ یہ ایک ایسی ہستی کا کلام ہے جس کو حقیقتوں کا براہ راست علم ہے۔ کوئی انسان جو حقیقتوں کا ذاتی علم نہ رکھتا ہو، وہ اپنے کلام میں ہرگز ایسا زور پیدا نہیں کر سکتا۔ یہاں میں نمونہ کے طور پر قرآن کی ایک چھوٹی سی سورت نقل کروں گا۔

اِذَا السَّمَاۗءُ انْفَطَرَتْ ۝	جب آسمان پھٹ جائے گا،
وَاِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ ۝	جب ستارے بکھر جائیں گے،
وَاِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ ۝	جب دریا ابل پڑیں گے،
وَاِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ ۝	جب قبریں الٹ دی جائیں گی،
عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ ۝	اس دن ہر شخص جان لے گا جو اس نے آگے بھیجا اور جو اس نے پیچھے چھوڑا
يٰٓاَيُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ ۝	اے انسان تجھکو خدائے عظیم کے بارہ میں کس چیز نے دھوکے

اَلَّذِیْ خَلَقَكَ فَسَوّٰكَ
فَعَدَلَكَ فِیْۤ اَیِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ
رَكَّبَكَ ؕ كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُوْنَ
بِالدِّیْنِ ۙ وَ اِنَّ عَلَیْكُمْ
لَحٰفِظِیْنَ ۙ كِرَامًا كَاتِبِیْنَ ۙ
یَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ۝
اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ ۚ وَ اِنَّ
الْفُجَّارَ لَفِیْ جَحِیْمٍ ۚ یَّصْلَوْنَهَا
یَوْمَ الدِّیْنِ ۝ وَ مَا هُمْ عَنْهَا
بِغَآىٕبِیْنَ ؕ وَ مَاۤ اَدْرٰىكَ مَا
یَوْمُ الدِّیْنِ ۝ ثُمَّ مَاۤ اَدْرٰىكَ
مَا یَوْمُ الدِّیْنِ ۝ یَوْمَ لَا تَمْلِكُ
نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَیْـًٔا ؕ
وَ الْاَمْرُ یَوْمَىٕذٍ لِّلّٰهِ ۝

میں ڈال رکھا ہے۔ جس نے تجھے خلق کیا
تیرا تسویہ فرمایا اور پھر مناسبت قائم کی۔
اس نے جیسا چاہا ویسا تم کو بنایا، نہیں
بلکہ تم فیصلہ کے دن کا انکار کرتے ہو۔
حالاں کہ تمہارے اوپر نگہبان مقرر ہیں
صحیح صحیح لکھنے والے۔ وہ جانتے ہیں جو تم
کرتے ہو۔ یقیناً اچھے لوگوں کے لئے نعمتیں
ہیں اور یقیناً برے لوگوں کے لئے جہنم
ہے۔ وہ فیصلہ کے روز اس میں ڈالے
جائیں گے اور وہ ہرگز اس سے بھاگ
نہیں سکتے اور کیا تم جانتے ہو کہ فیصلہ
کا دن کیا ہے پھر کیا تم جانتے ہو کہ فیصلہ
کا دن کیا ہے وہ ایک ایسا دن ہے جب
کہ کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے لئے
کچھ نہ کر سکے گا اور اس دن اقتدار صرف خدا کے لئے ہوگا۔

کس قدر یقین سے بھرا ہوا ہے یہ کلام جس میں زندگی کی ابتدا اور انتہا سب کچھ بیان کر دی گئی ہے۔ کوئی بھی انسانی کتاب جو زندگی اور کائنات کے موضوع پر لکھی گئی ہو، اس یقین کی مثال پیش نہیں کر سکتی۔ سیکڑوں سال سے انسان کائنات کی حقیقت پر غور کر رہا ہے، بڑے بڑے فلسفی اور سائنس داں پیدا ہوئے، مگر کوئی اس یقین کے ساتھ بولنے کی جرأت نہ کر سکا۔ سائنس آج بھی یہ تسلیم کرتی ہے کہ وہ کسی قطعی اور صحیح علم سے ابھی بہت دور ہے جب کہ قرآن اس قدر یقین کے ساتھ بات کہتا ہے گویا وہ علم کا احاطہ کئے ہوئے ہے اور حقیقت سے آخری حد تک واقف ہے۔

۲۔ قرآن کے کلام الٰہی ہونے کی دوسری دلیل یہ ہے کہ اس نے مابعد الطبیعی حقائق سے لے کر تمدنی مسائل تک تمام اہم امور پر گفتگو کی ہے مگر کہیں بھی اس کے بیانات میں تضاد نہیں پایا جاتا۔ اس کلام کے اوپر تقریباً ڈیڑھ ہزار برس پورے

ہو رہے ہیں۔ اس دوران میں بہت سی نئی نئی باتیں انسان کو معلوم ہوئی ہیں مگر اس کی باتوں میں اب بھی کوئی تضاد ظاہر نہ ہو سکا، حالاں کہ انسانوں میں سے کسی ایک فلسفی کا بھی اس حیثیت سے نام نہیں لیا جا سکتا کہ اس کا کلام تضاد اور اختلاف سے پاک ہے۔ اس دوران میں ہزاروں فلسفی پیدا ہوئے جنہوں نے اپنی عقل سے زندگی اور کائنات کی توجیہ کرنے کی کوشش کی مگر بہت جلد ان کے کلام کا تضاد ظاہر ہو گیا اور زمانہ نے انھیں رد کر دیا۔

کسی کلام کا تضاد سے پاک ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ حقیقت سے کلی مطابقت رکھتا ہے۔ جو شخص حقیقتوں کا علم نہ رکھتا ہو یا صرف جزئی علم اسے حاصل ہو وہ جب بھی حقیقت کو بیان کرنے بیٹھے گا لازمی طور پر تضادات کا شکار ہو جائے گا۔ وہ ایک پہلو کی تشریح کرتے ہوئے دوسرے پہلو کی رعایت نہ کر سکے گا۔ وہ ایک رخ کو کھولے گا تو دوسرے رخ کو بند کر دے گا۔ زندگی اور کائنات کی توجیہ کا سوال ایک ہمہ گیر سوال ہے۔ اس کے لئے ساری حقیقتوں کا علم ہونا ضروری ہے۔ اور چونکہ انسان اپنی محدود صلاحیتوں کی بنا پر ساری حقیقتوں کا علم حاصل نہیں کر سکتا۔ اس لئے وہ سارے پہلوؤں کی رعایت بھی نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کے بنائے ہوئے فلسفوں میں تضاد کا پایا جانا لازمی ہے۔ قرآن کی یہ خصوصیت کہ وہ اس قسم کے تضادات سے پاک ہے اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ وہ حقیقت کی صحیح ترین تعبیر ہے، اس کے سوا تمام تعبیریں غلط ہیں، اس واقعہ کو میں مثال کے ذریعہ واضح کروں گا۔

ا۔ زندگی کے موضوع پر جو کتاب لکھی جائے اس کا ایک ضروری باب زندگی کے فرائض متعین کرنا ہے۔ یہ فرائض متعین کرنے میں ضروری ہے کہ ان کے مختلف پہلوؤں کی ٹھیک ٹھیک رعایت کی جائے۔ ایسا نہ ہو کہ ایک پہلو سے کوئی ایسا حکم دیا جائے جو دوسرے پہلو سے ٹکراتا ہو۔ مثلاً عورت اور مرد کی حیثیت متعین کرنا تمدنی زندگی کا ایک اہم مسئلہ ہے۔ آج کے ترقی یافتہ دور نے یہ قرار دیا ہے کہ عورت اور مرد کے درمیان مساوات ہونی چاہئے اور زندگی کے ہر شعبہ میں دونوں کو یکساں طور پر کام کرنے کا موقع دینا چاہئے، مگر یہاں انسانی ساخت کا یہ تمدنی اصول ایک نہایت اہم صورتِ واقعی سے ٹکرا رہا ہے۔ یعنی اس حقیقت سے کہ حیاتیات (Biology) کے اعتبار سے دونوں صنفوں کے درمیان مساوات نہیں، اور یہ ممکن نہیں کہ دونوں یکساں طور پر

زندگی کا بوجھ اٹھا سکیں۔ اس کے برعکس قرآن نے تمدنی زندگی میں عورت اور مرد کا جو مقام متعین کیا ہے وہ دونوں کی پیدائشی ساخت کے عین مطابق ہے اور قانون اور حقیقت کے درمیان کوئی تضاد پیدا نہیں ہوتا۔

۲۔ مارکس نے انقلاب کا فلسفہ یہ بتایا ہے کہ جس طرح ایک عالمگیر قانون کشش سے ستارے حرکت کر رہے ہیں اسی طرح کچھ ناگزیر تاریخی قوانین ہیں جو سماجی تبدیلیوں کا سبب بنتے ہیں۔ یہ قوانین مسلسل طور پر اپنا کام کر رہے ہیں اور اسی کے مطابق انسانی زندگی میں انقلابات آتے ہیں مگر اس فلسفہ کو مرتب کرنے کے ساتھ ہی اس نے یہ نعرہ بھی لگایا کہ

"دنیا کے مزدورو متحد ہو جاؤ"

ظاہر ہے کہ یہ دونوں باتیں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اگر سماجی تبدیلیوں کا کوئی ناگزیر تاریخی قانون ہے تو سیاسی جدوجہد کی ضرورت نہیں اور اگر سیاسی جدوجہد کے ذریعہ انقلاب آتا ہے تو پھر ناگزیر تاریخی قانون کے کیا معنیٰ۔

اس کے برعکس قرآن انسانی ارادہ کو تسلیم کرتا ہے۔ اس کا فلسفہ یہ ہے کہ زندگی میں جو واقعات پیش آتے ہیں وہ انسان کی اپنی کوششوں کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ مادی دنیا کی طرح ان واقعات کی کوئی لازمی منطق نہیں ہے۔ بلکہ انسانی کوشش انھیں کوئی بھی شکل دے سکتی ہے۔ یقیناً فطرت کے کچھ قوانین ہیں اور اس سلسلہ میں وہ اہم کام کرتے ہیں مگر ان کے کام کی نوعیت یہ ہے کہ وہ انسانی کوششوں کا ساتھ دے کر اسے منزل تک پہونچا دیتے ہیں نہ کہ خود انسانی کوششیں ان قوانین کا خارجی ظہور ہیں۔ اس طرح قرآن کے نظریہ اور اس کی دعوت میں کوئی تضاد نہیں۔ وہ جب اپنے نظریہ کو قائم کرنے کے لئے لوگوں کو پکارتا ہے تو وہ اپنے فلسفہ کی تصدیق کرتا ہے نہ کہ اس کی تردید۔ اس کے برعکس مارکسی فلسفہ اس کے عملی پروگرام سے صاف ٹکرا رہا ہے، کمیونسٹ پارٹیوں کا وجود حقیقی معنوں میں مارکسی فلسفہ کی تردید ہے، کمیونسٹ مینی فسٹو کا آخری فقرہ اس کے پہلے فقرہ کو رد کر دیتا ہے۔

قرآن کی تعلیمات کو اگر آپ انسانی فلسفوں کے مقابلہ میں رکھ کر دیکھیں تو اس قسم کی بہت مثالیں پائیں گے۔

۳۔ قرآن کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ تقریباً ڈیڑھ ہزار برس سے زمین پر موجود ہے۔ اس زمانے میں کتنے انقلابات آئے ہیں، تاریخ میں کتنی الٹ پلٹ ہوئی ہے، زمانہ نے کتنی کرد ٹیں بدلی ہیں، مگر اب تک اس کی کوئی بات غلط ثابت نہیں ہوئی۔ وہ ہر زمانہ کے عقلی امکانات اور تمدنی ضروریات کا مسلسل ساتھ دیتا چلا جارہا ہے۔ اس کی تعلیمات کی ہمہ گیری کسی مقام پر بھی ختم نہیں ہوتی بلکہ ہر زمانہ کے مسائل پر حاوی ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہ اس کتاب عظیم کی ایک ایسی خصوصیت ہے جو کسی بھی انسانی کتاب کو اب تک حاصل نہیں ہو سکی ہے۔ انسان کا بنایا ہوا ہر فلسفہ چند ہی دنوں بعد اپنی غلطی ظاہر کر دیتا ہے، مگر صدیوں پر صدیاں گزرتی جارہی ہیں اور اس کتاب کی صداقت میں کوئی فرق نہیں آتا۔

یہ قانون اس وقت بنایا گیا تھا جب عرب کے غیر متمدن اور منتشر قبائل میں اسلامی ریاست قائم کرنے کا مسئلہ درپیش تھا، مگر اس کے بعد صدیوں تک وہ اسلامی حکومتوں کی تمام ضرورتیں پوری کرتا رہا اور موجودہ ترقی یافتہ دور میں بھی نہ صرف یہ کہ وہ زمانہ کا ساتھ دینے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے بلکہ صرف وہی ایک ایسا نظام ہے جو حقیقی معنوں میں زندگی کے مسائل کو حل کر سکتا ہے۔ ڈیڑھ ہزار برس پہلے جس طرح اس نے اپنی برتری ثابت کی تھی آج بھی وہ اسی طرح تمام فلسفوں پر فوقیت رکھتا ہے۔

یہ قرآن کا معجزہ ہے کہ زندگی کے بارہ میں اس نے جو نظریات پیش کئے تھے اور فرد اور جماعت کے عمل کے لئے جو خاکہ تجویز کیا تھا وہ آج بھی نہ تو پرانا ہوا ہے اور نہ اس میں کسی نقص کی نشاندہی کی جا سکتی ہے۔ اس دوران میں کتنے فلسفے پیدا ہوئے اور مر گئے کتنے نظام بنے اور بگڑ گئے مگر قرآن کے نظریہ کی صداقت اور اس کے عملی نظام کی افادیت آج بھی مسلم ہے۔ وہ ہوا اور پانی کی طرح زمانہ کی قید سے آزاد ہے۔

میں یہاں دونوں پہلوؤں سے ایک ایک مثال پیش کروں گا۔

قرآن نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ کائنات کا محرک ایک ذہن ہے جو بالا رادہ اسے حرکت دے رہا ہے۔ قرآن نے یہ دعویٰ یورپ کی نشاۃ ثانیہ سے بہت پہلے کیا تھا۔ اس کے بعد بہت سے فلسفی اور سائنس داں اٹھے جنھوں نے بڑے زور شور کے ساتھ

یہ دعویٰ کیا کہ کائنات محض ایک مادی مشین ہے جو خود بخود حرکت کر رہی ہے۔ یہ نظریہ دوسو برس تک انسانی ذہنوں پر حکومت کرتا رہا۔ ایسا معلوم ہوا کہ علم کی ترقی نے قرآن کے دعویٰ کو رد کر دیا ہے۔ مگر اس کے بعد خود کائنات کے مطالعہ سے سائنس دانوں پر یہ منکشف ہوا کہ زندگی اور کائنات کی توجیہ محض مادی قوانین کے ذریعہ نہیں کی جا سکتی اب سائنس دن بدن قرآن کے اس نظریہ کی طرف لوٹ رہی ہے کہ اس کائنات کے پیچھے ایک ذہن ہے جو اپنے ارادہ سے اس کو چلا رہا ہے۔ مشہور سائنس داں سر جیمز جینز اس تبدیلی کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

علم کے دریا نے پچھلے چند برسوں میں نہایت تیزی سے ایک نیا موڑ اختیار کیا ہے۔ تیس سال پہلے ہمارا خیال تھا یا ہم نے فرض کر لیا تھا کہ ہم ایک ایسی آخری حقیقت کی طرف بڑھ رہے ہیں جو اپنی نوعیت میں مشینی ہے۔ ایسا نظر آتا تھا کہ کائنات ایٹموں کے ایک ایسے بے ترتیب انبار پر مشتمل ہے جو اتفاقی طور پر اکٹھا ہو گئے ہیں اور جن کا کام یہ ہے کہ بے مقصد اور اندھی طاقتوں کے عمل کے تحت جو کوئی شعور نہیں رکھتیں، کچھ زمانے کے لئے ایک بے معنی رقص کریں جس کے ختم ہونے پر محض ایک مردہ کائنات باقی رہ جائے۔ اس خالص مشینی دنیا میں، مذکورہ بالا اندھی طاقتوں کے عمل کے دوران میں، زندگی ایک حادثہ کے طور پر بالکل اتفاق سے آپہونچی ہے۔ کائنات کا ایک بہت ہی چھوٹا گوشہ یا امکان کے طور پر اس طرح کے کئی گوشے کچھ عرصے کے لئے اتفاقی طور پر ذی شعور ہو گئے ہیں۔ مگر موجودہ معلومات کی روشنی میں طبیعیات کی حد تک سائنس کا اب اس بات پر تقریباً اتفاق ہے کہ علم کا دریا ہمیں ایک غیر مشینی حقیقت (Non Mechanical Reality) کی طرف لے جا رہا ہے۔

اسی مضمون میں آگے چل کر انھوں نے لکھا ہے

جدید معلومات ہم کو مجبور کرتی ہیں کہ ہم اپنے پچھلے خیالات پر نظر ثانی کریں جو ہم نے جلدی میں قائم کر لئے تھے۔ یعنی یہ کہ ہم اتفاق سے ایک ایسی کائنات میں آپڑے ہیں جس کو خود زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے

یا وہ باقاعدہ طور پر زندگی سے عداوت رکھتی ہے۔ اب ہم نے دریافت کر لیا ہے
کہ کائنات ایک ایسی خالق یا مدبر طاقت (Designing or Controlling Power)
کا ثبوت فراہم کر رہی ہے جو ہمارے شخصی ذہن سے بہت کچھ ملتی جلتی ہے۔"
(ماڈرن سائنٹفک تھاٹ، صفحہ ۱۰۴)

یہ نظری پہلو کی مثال تھی، اب عملی پہلو سے متعلق ایک مثال لیجئے۔ اسلام نے معاشرتی زندگی کا جو قانون بنایا ہے اس میں ایک مرد کو اجازت دی ہے کہ وہ چار عورتوں تک سے شادی کر سکتا ہے۔ اسلام کے بعد جب مغربی تہذیب اٹھی تو اس نے اس قانون کا بہت مذاق اڑایا اور اس کو جاہلیت کے زمانہ کا وحشی قانون قرار دیا۔ اس کے نزدیک یہ قانون عورتوں کے ساتھ سراسر ناانصافی تھی اور اس بنیاد پر کبھی بھی کوئی ترقی یافتہ تمدن تعمیر نہیں کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ مسیحیت میں اگرچہ اس کی گنجایش موجود تھی مگر مغربی تہذیب نے اس کو یک قلم اپنے یہاں سے خارج کر دیا اور اس کو ایک نہایت ذلیل فعل قرار دیا کہ کوئی شخص ایک عورت رکھتے ہوئے دوسری عورت سے شادی کرے۔ اس کی تبلیغ اس زور شور سے کی گئی کہ اب یہ حال ہے کہ نہ کوئی مرد اس کی جرأت کر سکتا ہے اور نہ کوئی عورت اپنے بارہ میں ایسا سوچ سکتی ہے کہ وہ کسی شخص کی دوسری یا تیسری بیوی بنے۔

مگر حالات نے —— اور خاص طور پر دوسری جنگ عظیم کے حالات نے —— اب یہ ثابت کر دیا ہے کہ ایک سے زیادہ شادیوں کی اجازت دراصل زندگی کی ایک عملی ضرورت ہے۔ کبھی بعض افراد کی زندگی میں اور کبھی پوری جماعت کے لئے ایسے غیر معمولی حالات پیدا ہو جاتے ہیں کہ دو میں سے کسی ایک چیز کا انتخاب ناگزیر ہو جاتا ہے۔ یا تو فواحش اور بدکاری کو قبول کیا جائے جس کا مطلب پورے تمدن کو ہولناک خطرہ میں مبتلا کر دینا ہے یا تعدد ازدواج کو اختیار کیا جائے جس سے مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے اور کوئی خرابی پیدا نہیں ہوتی۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد ان تمام ملکوں میں جو جنگ میں شریک تھے، یہ صورت حال پیش آئی کہ عورتیں زندہ رہیں اور مرد کثرت سے ہلاک ہو گئے۔ چنانچہ مردوں کی تعداد کم اور عورتوں کی تعداد بہت زیادہ ہو گئی جس کا اثر ابھی تک باقی ہے۔

۱۹۵۵ء کے اعداد و شمار کے مطابق جاپان میں ہر ایک مرد کے مقابلہ میں آٹھ عورتیں تھیں۔ اس جنگ کا سب سے زیادہ اثر جرمنی پر پڑا جہاں بے شمار عورتیں بیوہ اور کتنے بچے یتیم ہوگئے اور لڑکیوں کے لئے شوہر ملنا مشکل ہوگیا۔ اس کی وجہ سے ان ملکوں میں لاوارث اور ناجائز بچوں کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ جو یتیم ہوگئے تھے ان کا کوئی وارث نہیں رہا اور جو عورتیں شوہر سے محروم ہوگئی تھیں انھوں نے فطری تقاضے سے مجبور ہوکر اپنی خواہش پوری کرنے کے لئے ناجائز طریقے اختیار کرنے شروع کر دیئے۔ نوبت یہاں تک پہونچی کہ جرمنی میں بعض عورتوں کے گھروں پر اس قسم کا بورڈ نظر آنے لگا کہ،

(Wanted an Evening Guest)

(رات گزارنے کے لئے ایک مہمان چاہئے)

دوسری جنگ عظیم میں لڑنے والے ملکوں کے بیشمار مرد مارے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عورتیں شادی شدہ زندگی سے مایوس ہوکر طوائف کی زندگی گزارنے لگیں۔ جیمز کیمرون James Cameron دوسری جنگ عظیم میں جرمنی میں نامہ نگار تھے۔ اس سلسلے میں انھوں نے اپنی یادداشت شائع کی ہے۔ یہ برطانی نامہ نگار اس میں لکھتا ہے کہ جنگ کے خاتمہ پر جب میں برلن گیا تو شکست خوردہ شہر بنیادی طور پر بھوکی طوائفوں (Hungry Whores) سے بھرا ہوا تھا۔ میں نے اس کو اپنے ذہن سے نکالنا چاہا مگر میں نہ نکال سکا۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں۔

It is not so much that I have no stomach for the fight. I had no stomach for the victory.

ایسا نہ تھا کہ جنگ کی برداشت کی طاقت مجھ میں نہ ہو۔ مگر فتح کو برداشت کرنے کی طاقت مجھ میں نہیں تھی (گارجین ۱۰ اکتوبر ۱۹۸۲ء)

اگرچہ مغربی ذہن نے ابھی تک اس معاملہ میں اپنی غلطی تسلیم نہیں کی ہے مگر واقعات نے صریح طور پر اس کا غلط ہونا ثابت کر دیا ہے اور وہ دن دور نہیں جب زبان سے بھی اس کو تسلیم کر لیا جائے گا۔ اس وقت معلوم ہوگا کہ نکاح کے معاملہ میں جس اصول کو مغرب نے اختیار کیا تھا اس کا مطلب یہ ہے کہ سماج کو فحاشی میں مبتلا کر کے بے شمار جرائم کا دروازہ کھول دیا جائے۔ جب کہ اسلام کا اصول اصل مسئلہ کو بہترین طریقہ پر حل کرنا ہے اور سماج کو بہت شدید نقصانات سے بچا لیتا ہے۔

قرآن کے نظریات اور اس کے قوانین کی ابدیت کی یہ دو مثالیں تھیں جن سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ انسانی ساخت کے نظریے اور قوانین بن بن کر بگڑتے رہے مگر قرآن نے پہلے دن جو کچھ کہا تھا آخر دن تک اس کی سچائی میں کوئی فرق نہیں آیا وہ پہلے جس طرح حق تھا آج بھی اسی طرح حق ہے۔ قرآن کی یہ خصوصیت ظاہر کرتی ہے کہ وہ ایک ایسے ذہن سے نکلا ہے جس کا علم ماضی اور مستقبل پر محیط ہے۔ قرآن کی ابدیت قرآن کے کلام الٰہی ہونے کا کھلا ہوا ثبوت ہے۔

آخری بات

ہمارے مطالعہ نے اب ہمارے لئے حقیقت کے دروازے کھول دیئے ہیں۔ ہم نے اپنے سفر کا آغاز اس سوال سے کیا تھا کہ "ہم کیا ہیں اور یہ کائنات کیا ہے" اس کا جواب بہت سے لوگوں نے اپنے ذہن سے دینے کی کوشش کی ہے، مگر ہم نے دیکھا کہ یہ جوابات حقیقت کی صحیح تشریح نہیں کرتے۔ پھر ہمارے کانوں میں عرب سے نکلی ہوئی ایک آواز آئی۔ ہم نے اس پر غور کیا، اس کو کائنات کے فریم میں رکھ کر دیکھا، انسانی تاریخ میں اسے آزمایا اور فطرت کی گہرائیوں میں اتر کر اس کو پہچاننے کی کوشش کی۔ ہم نے دیکھا کہ کائنات، تاریخ اور انسانی نفسیات متفقہ طور پر اس کی تصدیق کر رہے ہیں، ہمارا تمام علم اور ہمارے بہترین احساسات بالکل اس کی تائید میں ہیں۔ جس حقیقت کی ہمیں تلاش تھی اس کو ہم نے پا لیا۔ اب ہمیں یہ فیصلہ کرنا ہے کہ ہم اس کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی اسٹوڈینٹس یونین کی طرف سے اسلامی تقریروں کا ایک ہفتہ منایا گیا جس کا عنوان تھا سلسلۂ تقاریر اسلام Series of lecture on Islam اس موقع پر راقم الحروف نے ۶ ستمبر ۱۹۵۸ کو یونیورسٹی کے یونین ہال میں ایک تقریر کی جو بعد کو اردو میں "حقیقت کی تلاش" اور عربی میں "الفحص عن الحق" کے نام سے شائع ہوئی۔ یہ مقالہ اسی کا نظر ثانی کیا ہوا اڈیشن ہے۔

اسلام کا تعارف

کائنات کا ایک خدا ہے جو اس کا خالق اور مالک ہے ۔ خدا نے ایک خاص سکیم کے تحت ہم کو پیدا کیا ہے جس کا علم وہ اپنے مخصوص اور منتخب بندوں کے ذریعہ ہم تک بھیجتا ہے جن کو ہم رسول کہتے ہیں ۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس سلسلے کے آخری رسول ہیں اور اب تمام دنیا کو آپ کی پیروی کرنی ہے ۔ جو شخص آپ کی دعوت کو پاتے اور پھر اس کو قبول نہ کرے ۔ وہ صرف آپ ہی کا انکار نہیں کرتا بلکہ درحقیقت خدا کے تمام نبیوں کا انکار کر دیتا ہے ۔ ایسا شخص خدا کا وفادار نہیں ۔ بلکہ اس کا باغی ہے ۔ اور خدا کی رحمتوں میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہے ——— یہ ہے مختصر طور پر دین اسلام کا تعارف جس کی مجھے اس مضمون میں تشریح کرنی ہے ۔

خدا کا وجود

سب سے پہلے اس سوال کو لیجیے کہ اس کائنات کا ایک خدا ہے ۔ بعض لوگ اس بات کو نہیں مانتے ۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ سارا کارخانہ محض ایک اتفاقی حادثے کے طور پر وجود میں آگیا ہے ۔ اور اپنے آپ چلا جا رہا ہے ۔ ہکسلے کے الفاظ میں ——— چھ بندر ایک ایک ٹائپ رائٹر لے کر بیٹھ جائیں ۔ اور اربوں کھربوں سال تک الل ٹپ طریقے سے ان کو پیٹتے رہیں تو ہوسکتا ہے کہ ان کے سیاہ کئے ہوئے کاغذات کے ڈھیر میں کسی صفحے پر شکسپیر کی ایک نظم نکل آئے ۔ اسی طرح اربوں اور کھربوں سال تک مادے کے اندھے عمل کے دوران میں بالکل اتفاق سے یہ دنیا بن گئی ہے ۔

یہ جواب جس نے صدیوں سے بہت سے لوگوں کو فریب میں مبتلا کر رکھا ہے ، یہ دراصل کوئی جواب نہیں ہے ۔ بلکہ محض چند الفاظ کا مجموعہ ہے ۔ کیونکہ اتفاق یا حادثہ بذات خود کوئی چیز نہیں ہے ۔ پھر جو چیز خود ہی اپنا وجود نہ رکھتی ہو وہ کسی دوسری چیز کو وجود میں لانے کا سبب کس طرح بن سکتی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ کائنات کی یہ تشریح کائنات کے اوپر بالکل چسپاں نہیں ہوتی ۔ یہ محض ایک بے بنیاد دعویٰ ہے ۔ جو ذہنوں میں گھڑ لیا گیا ہے ۔ اور کائنات کی حقیقی ساخت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے ۔ اس کے برعکس خدا کا تصور کائنات کے ساتھ بالکل ہم آہنگ ہو جاتا ہے ۔ وہ خود کائنات کے اندر سے بول رہا ہے ۔

کائنات اتنی پر حکمت اور اتنی منظم ہے کہ اس کا تصور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ کسی اتفاقی حادثے کے طور پر وجود میں آگئی ہو ۔ زمین پر جاندار چیزوں کی بقا کے لئے جو حالات ضروری ہیں وہ نہایت مکمل طور پر یہاں موجود ہیں ۔ کیا محض اتفاق کے نتیجے میں اتنے عمدہ حالات پیدا ہو سکتے ہیں ۔

کائنات میں نشانیاں

زمین اپنے محور پر ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے لٹو کی مانند گھومتی ہے ۔ اگر زمین کی رفتار ایک سو میل فی گھنٹہ ہوتی تو ہمارے دن اور رات اب کے دن اور رات سے دس گنا زیادہ لمبے ہوتے ۔ زمین کی تمام ہریالی اور ہماری بہترین فصلیں سو گھنٹے کی مسلسل دھوپ میں جھلس جاتیں اور جو بچ رہتیں وہ لمبی رات میں پالے کی نذر ہو جاتیں ۔

سورج جو ہماری زندگی کا سرچشمہ ہے ، اپنی سطح پر بارہ ہزار ڈگری فارن ہائٹ سے دہک رہا ہے ۔ یہ حرارت اتنی زیادہ ہے کہ بڑے بڑے پہاڑ بھی اس کے سامنے جل کر راکھ ہو جائیں گے ۔ مگر وہ ہماری زمین سے اتنے مناسب فاصلے پر ہے کہ یہ "کائناتی انگیٹھی" ہمیں ہماری ضرورت سے ذرہ بھر زیادہ گرمی نہ دے سکے ۔ اگر سورج دگنے فاصلہ پر چلا جائے تو زمین پر اتنی سردی پیدا ہو گی کہ ہم سب لوگ جم کر برف ہو جائیں گے ۔ اور اگر وہ آدھے فاصلے پر آجائے تو زمین پر اتنی حرارت پیدا ہو گی کہ تمام جاندار اور تمام پودے جل بھن کر خاک ہو جائیں گے ۔

زمین کا کرہ فضا میں سیدھا کھڑا نہیں ہے بلکہ ۲۳ درجے کا زاویہ بناتا ہوا ایک طرف جھکا ہوا ہے یہ جھکاؤ ہمیں ہمارے موسم دیتا ہے اور اس کے نتیجے میں زمین کا زیادہ سے زیادہ حصہ آباد کاری کے قابل ہو جاتا ہے اور مختلف قسم کی نباتات اور پیداوار حاصل ہوتی ہیں ۔ اگر یہ جھکاؤ نہ ہوتا تو سمندر سے اٹھتے ہوئے بخارات سیدھے شمال یا جنوب کو چلے جاتے اور ہمارے براعظم برف سے ڈھکے رہتے ۔

چاند ہم سے تقریباً ڈھائی لاکھ میل کے فاصلے پر ہے ۔ اس کے بجائے اگر وہ صرف پچاس ہزار میل دور ہوتا تو سمندروں میں مدوجزر کی لہریں اتنی بلند ہوتیں کہ تمام کرۂ ارض دن میں دو بار پانی میں ڈوب جاتا اور بڑے بڑے پہاڑ موجوں کے ٹکرانے سے گھس کر ختم ہو جاتے ۔

یہ ہماری کائنات کے چند نہایت معمولی اور بالکل سادہ واقعات ہیں ۔ ان کے سوا بے شمار ایسے واقعات ہیں جو ظاہر کرتے ہیں کہ ہماری زمین پر ان کا اجتماع محض اتفاقی طور پر نہیں ہو سکتا ۔ اور نہ محض اتفاق انہیں باقی رکھ سکتا ہے ۔ یقیناً کوئی ہے جو ان واقعات کو وجود میں لایا ہے اور ان کو اس قدر منظم طریقہ پر مسلسل باقی رکھے ہوئے ہے ۔ کائنات اتنی مربوط اور منظم ہے

کہ جب بھی ہم اس کے کسی واقعہ کو بیان کرتے ہیں تو درحقیقت ہم اس کو محدود کر دیتے ہیں۔ کائنات کے ایک ایک جزء کے اندر اتنی حکمتیں ہیں کہ جب بھی ہم اس کی کسی حکمت کا ذکر کرتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا ہم اس کو ایک کمتر درجے کی چیز بنا کر پیش کر رہے ہیں۔ ایسی ایک کائنات کو خدا کی مخلوق ماننا اگر کسی کو خلافِ عقل معلوم ہوتا ہے تو اس سے زیادہ خلاف عقل بات یہ ہے کہ اس کائنات کو بے خدا فرض کر لیا جائے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ اگر خدا نے سب چیزیں پیدا کی ہیں تو خود خدا کو کس نے پیدا کیا ہے۔ مگر یہ ایک ایسا سوال ہے جو ہر حال میں پیدا ہوتا ہے۔ خواہ ہم خدا کو مانیں یا نہ مانیں۔ ہم دو میں سے کسی ایک چیز کو بلا سبب ماننے پر مجبور ہیں۔ یا خدا کو بے سبب مانیں یا کائنات کو۔ ہمارے سامنے ایک عظیم کائنات ہے جس کو ہم دیکھتے ہیں، جس کو ہم محسوس کرتے ہیں۔ ہم مجبور ہیں کہ اس کائنات کے وجود کو تسلیم کریں۔ ہم اس کا انکار نہیں کر سکتے۔ پھر ہم یا تو یہ کہیں کہ کائنات خود سے وجود میں آگئی ہے یا یہ کہیں کہ کوئی اور ہستی ہے جس نے اس کو بنایا ہے۔ دونوں صورتوں میں ہم کسی نہ کسی کو بلا سبب تسلیم کریں گے۔ پھر کیوں نہ ہم خدا کو بلا سبب مان لیں جس کو ماننے کی صورت میں ہمارے تمام سوالات کا جواب مل جاتا ہے۔ جبکہ کائنات کو بلا سبب ماننے کی شکل میں کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ وہ تمام سوالات جو اس مسئلہ کے ارد گرد پیدا ہوتے ہیں وہ سب کے سب بدستور باقی رہتے ہیں۔

بعض لوگوں نے فلسفیانہ موشگافی کے ذریعہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ کائنات کوئی چیز ہی نہیں ہے۔ سب کچھ صرف ہمارا وہم ہے۔ مگر ایک شخص جب یہ بات کہتا ہے تو ٹھیک اسی وقت وہ کائنات کے وجود کو تسلیم کر لیتا ہے۔ آخر یہ سوال ہی کیوں پیدا ہوا کہ کائنات کوئی چیز ہے یا نہیں۔ سوال کا پیدا ہونا خود ظاہر کرتا ہے کہ کوئی چیز ہے جس کے بارے میں سوال درپیش ہے۔ اور کوئی ہے جس کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو رہا ہے۔ اس طرح فلسفۂ تشکیک بیک وقت انسان اور کائنات دونوں کو تسلیم کر لیتا ہے۔

خدا کے ساتھ ہمارا تعلق

خدا کو ماننے کے بعد فوراً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ ہمارا تعلق کیا ہے۔ پچاس سال پہلے یہ خیال کیا جاتا تھا کہ اگر خدا کا کوئی وجود ہے بھی تو اس سے ہمارا تعلق نہیں ہو سکتا۔ مگر جدید کوانٹم نظریہ کے ذریعہ خود سائنس نے اس کی تردید کر دی ہے پہلے یہ سمجھا جاتا تھا کہ کائنات

ایک مشین ہے جو ایک مرتبہ حرکت دینے کے بعد مسلسل چلی جا رہی ہے۔ اس نظریہ پر سائنس دانوں کو اس قدر یقین تھا کہ انیسویں صدی کے آخر میں برلن کے پروفیسر ماکس پلانک (Max Planck) نے جب روشنی کے متعلق بعض ایسی تشریحات پیش کیں جو کائنات کے مشین ہونے کو غلط ثابت کر رہی تھیں تو اس پر سخت تنقیدیں ہونے لگیں اور اس کا مذاق اڑا گیا۔ مگر اس نظریئے کو زبردست کامیابی ہوئی اور بالآخر وہ ترقی کر کے نظریۂ مقادیر برقیات Quantum Theory کی صورت میں آج علم طبیعیات کے اہم اصولوں میں شمار کیا جاتا ہے۔[1]

پلانک کا نظریہ اپنی ابتدائی شکل میں یہ تھا کہ قدرت چھلانگوں کے ذریعہ حرکت کرتی ہے۔ ۱۹۱۷ء میں آئن سٹائن نے اس بات کی وضاحت کی کہ پلانک کا نظریہ صرف عدم تسلسل Discontinuity کو ثابت نہیں کرتا بلکہ زیادہ انقلاب انگیز نتائج کا حامل ہے۔ یہ اصول تعلیل کو اس کے بلند مقام سے معزول کر رہا ہے۔ جو اس سے پہلے عالم فطرت کے تمام واقعات کا واحد رہنما سمجھا جاتا تھا قدیم سائنس نے بڑے وثوق سے اعلان کیا تھا کہ قدرت صرف ایک ہی راستہ اختیار کر سکتی ہے جو سبب اور نتیجے کی مسلسل کڑیوں کے مطابق اس کے آغاز سے لے کر انجام تک معین ہو چکا ہے۔ مگر اب معلوم ہوا کہ یہ محض ناقص مطالعہ کا نتیجہ تھا۔ پہلے یہ کہا جاتا تھا کہ خدا کو اگر ماننا ہی ہے تو سبب اول کی حد تک اسے مان لو ورنہ آج کائنات کو خدا کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اب معلوم ہوا کہ کائنات صرف حرکت اول ہی کے لئے کسی محرک کی محتاج نہیں تھی بلکہ وہ ہر آن حرکت دیئے جانے کی محتاج ہے۔ کوانٹم نظریہ دوسرے لفظوں میں یہ بتاتا ہے کہ کائنات ایک خود چالو مشین نہیں ہے بلکہ وہ ایک ایسی مشین ہے جس کو ہر آن چلایا جا رہا ہے گویا ایک حیی وقیوم ہستی کا مسلسل فیضان ہے جو اس کو باقی رکھے ہوئے ہے۔ اگر ایک لمحے کے لئے بھی وہ اپنا فیضان واپس لے لے تو ساری کائنات اس طرح ختم ہو جائے گی جیسے سینما گھر میں بجلی کا سلسلہ ٹوٹنے سے پردۂ سیمین کے سارے واقعات غائب ہو جاتے ہیں اور ناظرین کے سامنے ایک سفید کپڑے کے سوا اور کچھ نہیں رہتا۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اس دنیا کا ہر ذرہ اپنے وجود اور حرکت کے لئے ہر آن قادر مطلق سے اجازت طلب کرتا ہے۔ اس کے بغیر وہ اپنی ہستی کو قائم نہیں رکھ سکتا۔

کائنات کے ساتھ خدا کا یہ تعلق خود بتاتا ہے کہ انسان کے ساتھ اس کا تعلق کیا ہونا چاہئے۔

---

[1] تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو۔ ماڈرن سائنٹفک تھاٹ، صفحات ۱۲ — ۲۰

ظاہر ہے کہ جس نے ہمیں خلق کیا ہے، جو ہمارے لئے تمام موزوں ترین حالات کو مسلسل باقی رکھے ہوئے ہے اور ان کو ہمارے حق میں ہموار کرتا رہتا ہے۔ جو ہر آن ہماری پرورش کر رہا ہے۔ اس کا ہمارے اوپر یہ لازمی حق ہے کہ ہم اپنے مقابلے میں اس کی برتر حیثیت کو تسلیم کریں۔ اور بالکل اس کے بندے بن جائیں۔ انسان جن قدروں سے واقف ہے ان میں سب سے نمایاں اور اہم ترین قدر یہ ہے کہ احسان کرنے والے کا احسان مانا جائے۔ محسن خواہ اپنی طرف سے نہ دبائے مگر جو احسان مند ہے وہ خود اس کے سامنے دب جاتا ہے، محسن کے آگے اس کو نظر اٹھانے کی ہمّت نہیں ہوتی۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا کا خدا ہونا خود ہی اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ ہم اس کی خدائی کو تسلیم کریں اور اس کی مرضی پوری کرنے کو اپنی زندگی کا مقصد بنائیں۔ بندے کی طرف سے خدا کی اطاعت کے لئے اس کے سوا کسی اور دلیل کی ضرورت نہیں۔

مگر بات صرف اتنی ہی نہیں ہے۔ یہ صرف حق شناسی کا تقاضا نہیں ہے کہ ہم خدا کی خدائی اور اس کے مقابلے میں اپنی بندگی کو تسلیم کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے لئے اس کے سوا کوئی راہ بھی نہیں ہے۔ ہماری زندگی کے سارے مسائل خدا سے متعلق ہیں۔ ہم کو جو کچھ ملے گا، اسی سے ملے گا۔ اس کے سوا کوئی اور ہمیں کچھ نہیں دے سکتا۔ ہم اس کائنات میں اس قدر عاجز اور مجبور ہیں کہ خدا کی مدد کے بغیر ایک لمحہ کے لئے اپنا وجود باقی نہیں رکھ سکتے۔ پھر خدا کو چھوڑ کر آخر ہم اور کہاں جا سکتے ہیں۔

ذرا غور کیجئے، یہ ہندوستان کی شمالی سرحد پر ہمالیہ پہاڑ کا ڈھائی ہزار میل لمبا سلسلہ کس نے قائم کیا ہے۔ ہم نے یا خدا نے۔ اگر ہمالیہ پہاڑ نہ ہوتا تو خلیج بنگال سے اٹھنے والی جنوب مشرقی ہوائیں جو ہر سال ہمارے لئے بارش لاتی ہیں بالکل پانی نہ برساتیں۔ وہ سیدھی روس کی طرف نکل جاتیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ تمام شمالی ہندوستان منگولیا کی طرح ریگستان ہوتا۔

آپ کو معلوم ہے کہ سورج اپنی غیر معمولی کشش سے ہماری زمین کو کھینچ رہا ہے، اور زمین ایک مرکز گریز قوت (Centrifugal Force) کے ذریعہ اس کی طرف کھنچ جانے سے اپنے آپ کو روکتی ہے۔ اس طرح وہ سورج سے دور رہ کر فضا کے اندر اپنا وجود باقی رکھے ہوئے ہے۔ اگر کسی دن زمین کی یہ قوت ختم ہو جائے تو وہ تقریباً چھ ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے سورج کی طرف کھنچنا شروع ہو جائے گی، اور چند ہفتوں میں سورج کے اندر اس طرح جا گرے گی جیسے کسی بہت بڑے

الاؤ کے اندر کوئی تنکا گر جائے۔ ظاہر ہے کہ زمین کو یہ طاقت ہم نے نہیں دی ہے بلکہ اس خدا نے دی ہے جس نے زمین کو پیدا کیا ہے۔

کائنات کے جس حصے میں ہم رہتے ہیں اس کا نام نظام شمسی ہے، اگر آپ کسی دور دراز مقام پر بیٹھ کر اس نظام کا مشاہدہ کر سکیں تو آپ دیکھیں گے کہ اتھاہ خلا کے اندر ایک آگ کا گولا بھڑک رہا ہے جو ہماری زمین سے تیرہ لاکھ گنا بڑا ہے۔ جس سے اتنے بڑے بڑے شعلے نکلتے ہیں جو کئی کئی لاکھ میل تک فضا میں اڑتے چلے جاتے ہیں، اسی کا نام سورج ہے۔ پھر آپ ان سیاروں کو دیکھیں گے جو سورج کے چاروں طرف اربوں میل کے دائرے میں پروانوں کی طرح چکر لگا رہے ہیں۔ ان دوڑتی ہوئی دنیاؤں میں ہماری زمین نسبتاً ایک چھوٹی دنیا ہے جس کی گولائی تقریباً پچیس ہزار میل ہے۔ یہ ہمارا نظام شمسی ہے جو بظاہر بہت بڑا معلوم ہوتا ہے۔ مگر کائنات کی وسعت کے مقابلے میں اس کی کوئی حیثیت نہیں۔

کائنات میں اتنے بڑے بڑے ستارے ہیں جن کے اوپر ہمارا پورا نظام شمسی رکھا جا سکتا ہے۔ اس بے انتہا وسیع اور عظیم کائنات میں ہماری زمین فضا میں اڑنے والے ایک ذرے سے بھی زیادہ حقیر ہے۔ ہم ایک چھوٹے سے کیڑے کی مانند اس ذرے سے چمٹے ہوئے ہیں اور خلا میں ایک کبھی نہ ختم ہونے والے سفر میں مصروف ہیں۔

یہ کائنات کے اندر ہماری حیثیت ہے۔ غور کیجئے انسان کس درجہ حقیر ہے۔ وہ خارجی طاقتوں کے مقابلے میں کس قدر عاجز ہے۔ پھر جب ہماری حیثیت یہ ہے تو ہم خالق کائنات سے مدد طلب کرنے کے سوا اور کیا کر سکتے ہیں۔ جس طرح ایک چھوٹے بچے کی ساری کائنات اس کے ماں باپ ہوتے ہیں۔ اس کی زندگی، اس کی ضرورتوں کی تکمیل اور اس کے مستقبل کا انحصار بالکل اس کے والدین کے اوپر ہوتا ہے۔ اسی طرح بلکہ اس سے کہیں زیادہ انسان اپنے رب کا محتاج ہے۔ ہم خدا کی مدد اور اس کی رہنمائی کے بغیر اپنے لئے کسی چیز کا تصور نہیں کر سکتے۔ وہی ہمارا سہارا ہے اور اسی کی طرف ہمیں دوڑنا چاہیے۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو گئی کہ انسان خدا کی رہنمائی اور اس کی مدد کا محتاج ہے۔ خدا کے مقابلہ میں انسان کی یہی حیثیت قرار پاتی ہے اور خود انسان کے لئے بھی اس کے سوا چارہ نہیں ہے کہ وہ خدا سے اپنے لئے مدد اور رہنمائی کی درخواست کرے۔ یہ حقیقت پسندی ہے اور حقیقت پسندی بلاشبہ انسان کی سب سے بڑی خوبی ہے۔

معرفت کا حصول

یہاں پہنچ کر جب ہم اپنے گرد و پیش کی دنیا پر غور کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ کائنات کے خالق کی طرف سے اپنی مخلوقات کے لئے مدد اور رہنمائی کا ایک مستقل عمل جاری ہے۔ جس کو جس چیز کی ضرورت ہے اس کو وہ چیز پہنچائی جا رہی ہے۔

ایک معمولی بھڑ (انجنا) کی مثال لیجیئے۔ بھڑ کا طریقہ ہے کہ وہ انڈے دینے سے پہلے زمین میں ایک گڑھا کھودتی ہے اور ایک ٹڈے کو قابو میں کر کے اس کو گڑھے میں رکھ دیتی ہے۔ ایسا کرتے وقت وہ نہایت صحت کے ساتھ ٹڈے کے اس خاص عصبی مقام پر ڈنک مارتی ہے جس سے ٹڈا مرتا نہیں صرف بے ہوش رہتا ہے اور تازہ گوشت کا ذخیرہ بن جاتا ہے۔ بھڑ اب اس بے ہوش ٹڈے کے ارد گرد انڈے دیتی ہے تاکہ انڈوں سے نکل کر بچے اس زندہ ٹڈے کو دھیرے دھیرے کھاتے رہیں۔ کیونکہ مردہ گوشت ان بچوں کے لئے مہلک ہے۔ اتنا انتظام کر لینے کے بعد بھڑ وہاں سے اڑ جاتی ہے اور پھر کبھی آکر بچوں کو نہیں دیکھتی۔ مگر اس کے باوجود بھڑ کا یہ بچہ جب بڑا ہوتا ہے تو وہ بھی ٹھیک اسی عمل کو دہراتا ہے ساری بھڑیں اس کام کو زندگی میں ایک بار اور پہلی بار بالکل ٹھیک ٹھیک انجام دیتی ہیں۔ غور کیجیئے کہ وہ کون ہے جو اس بھڑ کے بچے کو سکھاتا ہے کہ اپنی نسل کو جاری رکھنے کے لئے وہ بھی آئندہ وہی عمل کرے جو اس کے ساتھ اس کے ماں باپ نے کیا تھا۔ حالانکہ اپنے ماں باپ کے عمل کو اس نے کبھی نہیں دیکھا۔

اسی حیرت ناک عمل کو دیکھ کر فلسفی برگساں نے کہا تھا؛ کیا بھڑ نے کسی اسکول میں ماہرِ عضویات کی تعلیم حاصل کی ہے۔

اسی طرح ایک لمبی مچھلی کو لیجیئے جسے انگریزی میں (Eal) کہتے ہیں۔ ڈنمارک کے ماہر حیوانات ڈاکٹر شمٹ (Johannes Schmidt) نے کئی سال کی تحقیق کے بعد معلوم کیا ہے کہ یہ عجیب و غریب جاندار اپنی زندگی کی جوانی میں ہر جگہ کے آبی مرکزوں اور ندیوں سے نکل نکل جزیرۂ برموڈا کے پاس جمع ہوتے ہیں جہاں بحر اٹلانٹک سب سے زیادہ گہرا ہو جاتا ہے۔ یورپ کی ایلین سمندر میں تین ہزار میل کا راستہ طے کر کے یہاں پہنچتی ہیں۔ وہیں یہ سب مچھلیاں بچے دیکر مر جاتی ہیں۔ یہ بچے جب آنکھ کھولتے ہیں تو اپنے آپ کو ایک سنسان آبی مرکز میں پڑا ہوا پاتے ہیں۔ ان کے پاس بظاہر معلومات حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا۔ پھر بھی وہ وہاں سے لوٹ کر دوبارہ انھیں کناروں پر آلگتے ہیں جہاں سے ان کے والدین چلے گئے تھے۔ وہ آگے بڑھتے ہوئے اپنے ماں باپ

والی ندیوں، جھیلوں اور آبی مرکزوں میں پہنچ جاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ کسی بھی آبی مرکز سے ایلیں ہمیشہ کے لئے غائب نہیں ہو جاتیں۔ اور یہ سب کچھ اس طرح ہوتا ہے کہ امریکہ کی کوئی ایل یورپ میں نہیں ملتی اور نہ یورپ کی کوئی ایل امریکہ کے سمندروں میں پائی جاتی ہے پھر آمد و رفت کی یہ معلومات انہیں کہاں سے حاصل ہوتی ہیں۔

یہ کام "وحی" کے ذریعہ ہوتا ہے۔ وحی، پیغام رسانی کے اس مخفی سلسلے کو کہتے ہیں جو خدا اور اس کی مخلوقات کے درمیان جاری ہے۔ کوئی مخلوق زندگی گذارنے کے لئے کیا کرے اور خالقِ کائنات نے اپنی مجموعی اسکیم کے اندر اس کے ذمے جو فرض عائد کیا ہے اس کو کس طرح انجام دے، اسی کو بتانے کا نام وحی ہے۔ اس وحی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جس کا تعلق انسان کے سوا دوسری مخلوقات سے ہے، اور دوسری وہ جس کا تعلق انسان سے ہے۔

انسان کے سوا جتنی زندہ مخلوقات اس زمین پر پائی جاتی ہیں وہ سب کی سب ارادے سے خالی ہیں۔ ان کا کام کسی سوچے سمجھے فیصلے اور ارادے کے تحت نہیں ہوتا بلکہ ایک غیر شعوری قسم کے طبعی میلان کے تحت ہوتا ہے جس کو ہم جبلت (Instinct) کہتے ہیں، یہ گویا ایک طرح کی زندہ مشینیں ہیں جو محدود دائرے میں اپنا متعین عمل کر کے ختم ہو جاتی ہیں۔ اس قسم کے جانداروں کے لئے ترک واختیار کا کوئی سوال نہیں۔ اس لئے ان کے پاس جو وحی آتی ہے وہ حکم اور قانون کی شکل میں نہیں آتی بلکہ جبلت یا عادتِ فطری کی شکل میں آتی ہے۔ ان کی ساخت اس طرز کی بنا دی جاتی ہے کہ وہ ایک مخصوص کام کو بار بار دہراتے رہیں۔ مگر انسان ایک ایسی مخلوق ہے جو فیصلے کی قوت رکھتا ہے۔

وہ اپنے ارادے سے کسی کام کو کرتا ہے اور کسی کو نہیں کرتا۔ وہ ایک کام کرنا شروع کرتا ہے، پھر اسے بالقصد چھوڑ دیتا ہے اور ایک کام کو نہیں کرتا اور بعد کو اسے کرنے لگتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ انسان بھی اگرچہ اسی طرح خدا کا بندہ ہے جس طرح اس کی دوسری مخلوقات، مگر اس کو حالتِ امتحان میں رکھا گیا ہے۔ جو کام دوسری مخلوقات سے عادتِ فطرت کے تحت لیا جا رہا ہے انسان کو وہی کام اپنے فیصلے اور ارادے سے کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کے پاس جو وحی آتی ہے وہ حکم اور قانون کی شکل میں آتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں عام حیوانات کی وحی ان کی فطرت میں پیوست کر دی گئی ہے۔ اور انسان کی وحی خارج سے اسے سنائی جاتی ہے۔ عام حیوانات کو کیا کرنا ہے اس کا علم وہ پیدائشی طور پر اپنے ساتھ لے کر آتے ہیں۔ اس کے برعکس انسان

جب عقل اور ہوش کی عمر کو پہنچتا ہے تو خدا کی طرف سے پکار کر اسے بتایا جاتا ہے کہ تم کو کیا کرنا چاہئے اور کیا نہیں کرنا چاہئے۔

اس پیغام رسانی کا ذریعہ رسالت ہے۔ جو شخص یہ پیغام لے کر آتا ہے اس کو ہم رسول کہتے ہیں۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے ایک نیک بندے کو چن لیتا ہے اور اس کے قلب پر اپنا پیغام اتارتا ہے۔ اس طرح وہ شخص براہ راست خدا سے اس کی مرضی کا علم حاصل کرکے دوسرے انسانوں تک پہنچاتا ہے۔ رسول گویا وہ درمیانی کڑی ہے جو بندے کو اس کے خدا سے جوڑتی ہے۔

وحی کا مسئلہ

اب ہمیں اس سوال پر غور کرنا ہے کہ کسی بندۂ خاص پر خدا کی وحی کس طرح آتی ہے اور یہ کہ موجودہ زمانے میں وہ کون سی "وحی" ہے جس سے ہمیں خدا کی مرضی کا علم حاصل ہوگا۔

اس مسئلے کو سمجھنے کے لئے ایک مثال لیجئے، انسان نے جو مشینیں اور جو آلات بنائے ہیں وہ تقریباً سب کے سب لوہے کے ہیں۔ اگر لوہے کی تاریخ سامنے رکھی جائے تو یہ بات نہایت عجیب معلوم ہوگی کہ انسان نے کس طرح اس کو دریافت کیا، جبکہ انسان کو لوہے کے متعلق پہلے سے کوئی علم نہیں تھا۔ اس نے کس طرح اس کے ذرات کو یکجا کیا جو مختلف مرکبات کی شکل میں زمین کی مختلف چٹانوں کے ساتھ مخلوط ہوکر منتشر پڑے تھے۔ اور پھر انہیں خالص لوہے کی ٹھوس شکل میں تبدیل کیا۔

یہی حال دوسری ایجادات کا بھی ہے۔ یہ بات کسی طرح سمجھ میں نہیں آتی کہ ان ایجادات کی طرف انسانی ذہن کی رہنمائی کس طرح ہوئی۔ وہ کون سی قوت ہے جو تجربہ اور مشاہدہ کے دوران ایک سائنس داں کو اس مخصوص نکتے تک پہنچا دیتی ہے جہاں پہنچ کر اسے ایک مفید اور کارآمد نتیجہ حاصل ہوتا ہے۔ جو بات ہم کو معلوم نہیں تھی وہ کیسے معلوم ہوگئی۔ اس علم کا ذریعہ وہی خدائی فیضان ہے جس کو ہم وحی کہتے ہیں۔ سب کچھ جاننے والا اپنے علم میں سے تھوڑا سا حصہ اس کو عطا کر دیتا ہے جو کچھ نہیں جانتا۔

یہ فیضان وحی کا ابتدائی درجہ ہے جو غیر محسوس طور پر آتا ہے اور ہر شخص کو اس میں سے حصہ ملتا ہے۔ وحی کی دوسری قسم زیادہ ترقی یافتہ ہے، جو شعوری طور پر آتی ہے اور صرف ان لوگوں کے پاس آتی ہے جن کو رسالت کے لئے منتخب کر لیا گیا ہو۔ انسان کے پاس

حقیقت کا علم اور دنیا میں زندگی گذارنے کا طریقہ جو خدا کی طرف سے آیا ہے وہ اسی دوسری قسم کی وحی کے ذریعہ بھیجا جاتا ہے۔

وحی کی حقیقت کو ہم بس اسی قدر سمجھ سکتے ہیں۔ اس سے زیادہ کا مطالبہ کرنا دراصل ایک ایسا مطالبہ کرنا ہے جو انسان کے بس سے باہر ہے۔ ایک اڑتے ہوئے جہاز کو زمین سے لاسلکی پیغام بھیجا جاتا ہے جس کو ہوائی جہاز پر بیٹھا ہوا آدمی پورے یقین کے ساتھ صاف الفاظ میں سن لیتا ہے۔ یہ ہماری قریبی زندگی کا ایک واقعہ ہے۔ مگر آج تک اس کی مکمل توجیہ نہیں ہوسکی کہ یہ واقعہ کس طرح وجود میں آتا ہے۔ یہی حال ان تمام واقعات کا ہے جن سے ہم اس زمین پر واقف ہیں۔ ہم تمام حقیقتوں کو صرف مجمل طور پر جانتے ہیں۔ جیسے ہی ہم کسی حقیقت کو آخری حد تک سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں ہماری قوتیں جواب دینے لگتی ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کی کلی واقفیت ہمارے بس سے باہر ہے۔ ایسی صورت میں وحی کی حقیقت کو مکمل طور پر سمجھنے کا مطالبہ کرنا کسی ایسے ہی آدمی کا کام ہوسکتا ہے جو خود اپنی حقیقت سے بے خبر ہو۔

سائنس نے اب یہ تسلیم کرلیا ہے کہ حقیقت مطلق کا علم حاصل کرنا انسان کے بس سے باہر ہے۔ اس سلسلے میں میں پروفیسر ہائزن برگ (Heisen Berg) کی دریافت کا حوالہ دوں گا جس کو وہ اصول عدم تعین (Principle of Indeterminacy) کا نام دیتا ہے۔ جیمز جینز نے اس اصول کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"قدیم سائنس کا خیال تھا کہ کسی ذرے مثلاً ایک الکٹران کا مقام مکمل طور پر بتایا جاسکتا ہے جبکہ ہم یہ جان لیں کہ کسی خاص وقت میں فضا کے اندر اس کا مقام اور اس کی رفتار کیا ہے۔ اگر ان معلومات کے ساتھ بیرونی اثرانداز طاقتوں کا بھی علم ہو جائے تو الکٹران کے تمام مستقبل کو معین کیا جاسکتا تھا۔ اور اگر کائنات کے تمام ذروں کے متعلق ان باتوں کا علم ہو جاتا تو ساری کائنات کے مستقبل کے متعلق پیشین گوئی کی جاسکتی تھی۔

مگر ہائزن برگ کی تشریح کے مطابق جدید سائنس اب اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ ان مقدمات کی دریافت میں قوانین قدرت حائل ہیں۔ اگر ہم یہ جان لیں کہ ایک الکٹران فضا میں کس خاص مقام پر ہے جب بھی ہم ٹھیک نہیں بتا سکتے کہ وہ کس رفتار سے حرکت کر رہا ہے۔ قدرت کسی حد تک گنجائش سہو (Margin of Error) کی اجازت دیتی ہے۔ لیکن اگر ہم اس گنجائش میں گھسنا چاہیں تو قدرت ہماری کوئی مدد نہیں کرتی۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت بالکل صحیح پیمائشوں سے قطعاً ناآشنا ہے۔

اسی طرح اگر ہمیں کسی الکٹران کی حرکت کی ٹھیک ٹھیک رفتار معلوم ہو تو قدرت ہمیں فضا کے اندر اس کا صحیح مقام دریافت کرنے نہیں دیتی، گویا کہ الکٹران کا مقام اور اس کی حرکت کسی لالٹین کی سلائڈ کی دو مختلف سمتوں پر نقش ہیں۔ اگر ہم سلائڈ کو کسی خراب لالٹین میں رکھیں تو ہم دو رخوں کے درمیان نصف کو روشنی میں لاسکتے ہیں۔ اور الکٹران کے مقام اور اس کی حرکت دونوں کو کچھ نہ کچھ دیکھ سکتے ہیں۔ اچھی لالٹین کے ذریعہ ایسا نہیں ہوسکتا کیونکہ ہم ایک پر جتنی زیادہ روشنی ڈالیں گے، دوسرا اتنا ہی دھندلا ہوتا چلا جائے گا۔ خراب لالٹین، قدیم سائنس ہے جس نے ہمیں اس فریب میں مبتلا کر دیا کہ اگر ہمارے پاس بالکل مکمل لالٹین ہو تو ہم کسی خاص وقت پر ذرے کے مقام اور اس کی رفتار کا ٹھیک ٹھیک تعین کر سکتے ہیں۔ یہی دھوکہ تھا جس نے سائنس میں جبریت (Determinism) کو داخل کر دیا، مگر اب جبکہ جدید سائنس کے پاس زیادہ بہتر لالٹین ہے اس نے ہم کو صرف یہ بتایا ہے کہ حالت اور حرکت کی تعیین حقیقت کے دو مختلف پہلو ہیں جنھیں ہم بیک وقت روشنی میں نہیں لاسکتے (ماڈرن سائنٹفک تھاٹ، صفحہ ۱۷۔۱۸)

اس سلسلہ میں آخری سوال یہ ہے کہ خدا کی وحی جو مختلف زمانوں میں انسانوں کے پاس آتی رہی ہے ان میں سے کون سی وحی ہے جس کی آج کے انسانوں کو پیروی کرنا ہے۔ اس کا جواب بالکل سادہ ہے۔ بعد کے لوگوں کے لئے وہی وحی قابل اتباع ہوسکتی ہے جو سب کے بعد آئی ہو۔ حکومت ایک ملک میں کسی شخص کو اپنا سفیر بنا کر بھیجتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس شخص کی سفارت اسی وقت تک کے لئے ہے جب تک وہ اس عہدے پر باقی ہو، جب اس کی مدت کارکردگی ختم ہو جائے اور دوسرے شخص کو اس عہدے پر مامور کر دیا جائے تو اس کے بعد وہی شخص حکومت کا نمائندہ ہوگا جس کو سب سے آخر میں نمائندگی کا موقع دیا گیا ہے۔

اس اعتبار سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی وہ آخری رسول ہیں، جو آج اور آئندہ قیامت تک کے لئے انسانیت کے رہنما ہیں، جو ساتویں صدی عیسوی میں عرب سے اٹھے تھے۔ جن کے بعد نہ کوئی نبی ہوا اور نہ آئندہ کوئی نبی ہوگا۔ آپ کا تمام نبیوں کے بعد تشریف لانا اس بات کی کافی وجہ ہے کہ آپ ہی کو حال اور مستقبل کے لئے خدا کا نمائندہ قرار دیا جائے۔ کیونکہ بعد کو آنے والا اپنے سے پہلے آنے والوں کو منسوخ کر سکتا ہے مگر پہلے آنے والا اپنے بعد آنے والے کو منسوخ نہیں کر سکتا۔ ہم ان تمام نبیوں کو مانتے ہیں جو خدا کی طرف سے آئے، ان میں سے کسی کا بھی ہم انکار نہیں کرتے۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ خدا کے رسولوں میں تفریق نہ کرو۔ (بقرہ۔ آخر) مگر یہ ظاہر ہے کہ اطاعت

اور پیروی صرف وقت کے نبی ہی کی ممکن ہے اور اسی کی ہونی چاہئے ۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی نبی کا نہ آنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ آپ ہی وقت کے نبی ہیں ۔ اور اب تمام انسانوں کو آپ ہی کی پیروی کرنی ہے ۔ جب کوئی نبی آتا ہے تو وہ دراصل اپنے وقت کے لئے خدا کا حکم ہوتا ہے ۔ وقت کے نبی کو چھوڑ کر اس سے پہلے کے کسی نبی کی اطاعت کا دعویٰ کرنا خدا پرستی نہیں بلکہ خود پرستی ہے ۔ ایسا شخص خدا کے یہاں اس کے وفاداروں میں شمار نہیں ہوگا بلکہ مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا کیا جائے گا اور خود تاریخ کے وہ رسول اس سے برأت کریں گے جن کی پیروی کا آج وہ دعویٰ کر رہا ہے ۔

ہو سکتا ہے کہ انسانی تاریخ کی سب سے پرانی اور ابتدائی مذہبی کتاب رگ وید ہو جو خدا کی ہدایت کے تحت مرتب کی گئی ہو جیسا کہ انجیل نسبتاً درمیانی زمانے کی الہامی کتاب ہے ۔ مگر اب یہ تمام کتابیں آؤٹ آف ڈیٹ ہو چکی ہیں ۔ اس سے قطع نظر کہ ان کے مضامین کی صحت مشکوک ہے ۔ اور اس سے قطع نظر کہ ان میں سے کوئی کتاب بھی اپنے کو آخری اور دائمی کتاب کی حیثیت سے پیش نہیں کرتی ، صرف یہ واقعہ کہ وہ خدا کے آخری ہدایت نامے سے پہلے نازل کی گئی تھیں ، ان کو آج کے لئے منسوخ قرار دے دیتا ہے ۔

ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ ہم حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو خدا کا رسول ہی کیوں تسلیم کریں ، میرا جواب یہ ہے کہ جن وجوہ سے آپ دوسرے رسولوں کو رسول مانتے ہیں انھیں وجوہ سے آخری رسول کو بھی رسول ماننا پڑیگا ۔ آپ کسی دوسرے رسول کے بارہ میں یہ ثابت کرنے کے لئے کہ وہ خدا کی طرف سے آئے تھے ، جو بھی اصول بنائیں گے اور جو مقدمات قائم کریں گے ، ٹھیک ٹھیک انھیں دلائل اور انھیں مقدمات کی بنا پر آپ کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی خدا کا رسول ماننا ہوگا ۔ اگر آپ آخری رسول کا انکار کرتے ہیں تو آپ کو سارے رسولوں کا انکار کر دینا پڑے گا ۔ اور اگر دوسرے رسولوں کو مانتے ہیں تو آپ کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ آخری رسول کو بھی تسلیم کریں اور جوں ہی آپ آخری رسول کو تسلیم کرتے ہیں ، آپ کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ اسی کو آخری سند قرار دیں ۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول ماننا اور آپ کو آخری سند تسلیم نہ کرنا دونوں بالکل متضاد چیزیں ہیں ، جو ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتیں ۔ خدا کے آخری حکم کی موجودگی میں اس کے سابقہ حکموں کا حوالہ دینا خدا کی اطاعت کا ایک ایسا طریقہ ہے جس سے خدا کبھی راضی نہیں ہو سکتا یہ خود اپنے نفس کی اطاعت ہے نہ کہ خدا کی اطاعت ۔

تعصب یا خدا پرستی

آخر میں یہ کہوں گا کہ مذہب یا خدا پرستی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک یہ کہ نسلی تعلق یا سماجی حالات کے نتیجہ میں آدمی کا کوئی مذہب بن جائے اور آدمی اس کو پکڑے رہے۔ دوسرے یہ کہ وہ خود اپنی عقل کو استعمال کرے اور سنجیدہ مطالعہ کے ذریعے کسی رائے پر پہنچے اور اس کو شعوری فیصلہ کے تحت اختیار کرلے۔ بظاہر دونوں ہی مذہب دکھائی دیتے ہیں۔ مگر پہلی چیز کا نام تعصب ہے اور دوسری چیز کا نام خدا پرستی۔

خدا ہر قسم کے تعصب اور بے عقلی سے پاک ہے۔ اس لئے خدا کبھی ایسے شخص کو نہیں اپنائے گا جو تعصب اور غیر معقولیت کا سرمایہ لئے ہوئے اس کے پاس پہنچے۔ خدا کا محبوب بندہ تو وہی ہے جو تمام تعصبات سے اوپر اٹھ کر سنجیدگی اور معقولیت کے راستہ کو اختیار کرے۔ خدا صرف اس شخص کو اپنے پڑوس کے لئے قبول کرے گا جو اس کا ہم جنس ہو۔ غیر ہم جنسوں کو وہ رد کرکے دور پھینک دے گا تاکہ وہ ہمیشہ کے لئے محرومی اور رسوائی کا عذاب سہتے رہیں۔

(نوٹ) آریہ سماج کی جشن جوبلی کے موقع پر سیوہارہ (بجنور) میں ایک آل مذاہب کانفرنس ہوئی اس موقع پر ۲۹ نومبر ۱۹۵۹ کو اسلام کے نمائندہ کی حیثیت سے راقم الحروف نے یہ مقالہ پڑھا۔

منزل کی طرف

آج کے اس جلسے کا جو عنوان ہے وہ محض ایک عنوان نہیں ہے بلکہ یہ وقت کے دل کی دھڑکنیں ہیں۔ ہم ایک ایسے مسئلے پر سوچنے کے لئے جمع ہوئے ہیں جو ساری دنیا کو درپیش ہے اور جس پر ہر جگہ غور و فکر کیا جا رہا ہے۔ یوں سمجھئے کہ پوری انسانیت کی طرف سے ایک سوال کیا گیا ہے اور ہمیں اس سوال کا جواب دینا ہے۔

پچھلی چند صدیوں کی تاریخ مذہب کے خلاف انسان کی بغاوت کی تاریخ ہے۔ قدیم ترین زمانے سے مذہب کو یہ حیثیت حاصل تھی کہ وہ فکر و عمل کے ہر میدان میں انسانی زندگی کی رہنمائی کرتا تھا۔ مگر صنعتی انقلاب اور سائنس کی ترقی کے بعد جب انسان تمدنی اعتبار سے ایک نئے دور میں داخل ہوا تو اسی کے ساتھ اس نے چاہا کہ ہر اس چیز سے علیحدگی اختیار کر لے جس کا تعلق ماضی سے ہو۔ چنانچہ اس نے مذہب کے پرانے راستے کو چھوڑ کر نئی خود ساختہ راہوں پر اپنا سفر شروع کر دیا۔ گاڑی کی تبدیلی کے ساتھ اس نے یہ بھی ضروری سمجھا کہ اس کی سمت بھی نئی ہونی چاہئے۔ لیکن پچھلے سو برس کے تجربے نے اس خیال کی غلطی واضح کر دی ہے۔ زندگی کے مسائل کو حل کرنے کے لئے اس قسم کی جتنی کوششیں کی گئیں وہ بری طرح ناکام ثابت ہوئیں۔ اور اب انسان ایک ایسے مقام پر کھڑا ہے جہاں اس کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ وہ اپنی پچھلی حالت کی طرف لوٹ جائے۔ انسانیت کا بھٹکا ہوا قافلہ دوبارہ اپنی صحیح منزل کی طرف واپس ہونے کے لئے بے چین ہے۔ مذہب جو ماضی میں انسان کا دستور العمل تھا وہ مستقبل میں پھر انسان کا دستور العمل بننے والا ہے۔

قانون کی ناکامی

پچھلے سماج میں مذہب جو کام کر رہا تھا وہ یہ تھا کہ صدیوں کے دوران میں مختلف بزرگوں کی تعلیم و تلقین کی وجہ سے کچھ خاص تصورات لوگوں کے ذہنوں میں رچ بس گئے تھے۔ اور ان کے خلاف سوچنا یا عمل کرنا گناہ سمجھا جاتا تھا۔ مذہب کی منسوخی[1] کے بعد جب یہ گرفت

[1] ایسا نہیں ہے کہ اس دوران میں مذہب کا بالکل خاتمہ ہو گیا ہو۔ زندگی کے دھارے کے نیچے وہ ہمیشہ باقی رہا اور آج بھی باقی ہے۔ البتہ زندگی کی سرگرمیوں میں پہلے جو مقام اسے حاصل تھا وہ بعد کو اسے حاصل نہیں رہا۔

ڈھیلی ہو گئی تو اس کی جگہ لینے کے لئے اصلاحی قسم کے قوانین وجود میں آئے۔ دوسرے لفظوں میں خدا کی اطاعت گزاری کی جگہ قانون کی حکمرانی نے لے لی۔ قانون اس متعین ضابطے کو کہتے ہیں جس کو کسی سماج میں لازمی طور پر قابل تسلیم قرار دیا گیا ہو اور جس کی خلاف ورزی پر آدمی کو سزا دی جا سکتی ہو۔ اس قسم کے قوانین ہر ملک میں نہایت وسیع پیمانے پر بنائے گئے۔ اس طرح گویا زندگی کے تمام پہلوؤں کے بارے میں ریاست کی طرف سے حکماً یہ بتایا گیا کہ وہ صحیح ترین رویہ کیا ہے جسے آدمی کو اختیار کرنا چاہئے۔ مگر ان قوانین کا فائدہ صرف یہ ہوا ہے کہ جو برائی پہلے سیدھے طریقے سے ہوتی تھی وہ ہیر پھیر کے ذریعہ ہونے لگی۔ قانون نے صرف برائی کی شکلوں کو بدلا ہے اصل برائی کو روکنے میں وہ بالکل ناکام ثابت ہوا ہے۔

حکومت دیکھتی ہے کہ کاروباری لوگ چیزوں میں ملاوٹ کر رہے ہیں، ناجائز اسٹاک رکھتے ہیں اور مختلف طریقوں سے عام پبلک کو پریشان کرتے ہیں۔ اس کو روکنے کے لئے وہ ایک قانون بناتی ہے اور اس کے نفاذ کے لئے مارکٹنگ انسپکٹروں کی ایک فوج مقرر کر دیتی ہے جو قانون کی دفعات لے کر ایک ایک دکان کو جانچنا شروع کرتے ہیں۔ مگر عملاً یہ ہوتا ہے کہ دکان دار انھیں رشوت دے کر لوٹا دیتے ہیں۔ اب حکومت اینٹی کرپشن ڈپارٹمنٹ کو حرکت میں لاتی ہے۔ مگر اس کا نتیجہ بھی صرف یہ نکلتا ہے کہ جو رشوت پہلے صرف مارکٹنگ انسپکٹر لے رہے تھے اس میں ایک اور محکمہ کے لوگ حصے دار بن جاتے ہیں۔ اسی طرح جب بھی حکومت کے علم میں کوئی برائی آتی ہے تو وہ اس کے خلاف ایک قانون بنا دیتی ہے یا ایک آرڈر جاری کر دیتی ہے۔ مگر اس کا فائدہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا کہ چلنے والے اپنا راستہ بدل کر چلنے لگتے ہیں۔ اگر کسی چیز کی درآمد و برآمد پر پابندی لگائی جاتی ہے تو اسمگلنگ شروع ہو جاتی ہے۔ اگر ٹیکس بڑھائے جاتے ہیں تو جعلی حسابات کے رجسٹر تیار ہو جاتے ہیں۔ کسی چیز کی کمی کے پیش نظر اس کے خرچ کو مقرر حد میں رکھنے کے لئے اس پر کنٹرول کیا جاتا ہے تو بلیک مارکٹنگ اور جعلی پرمٹ کا کاروبار جاری ہو جاتا ہے۔ کسی کاروبار کو قومی ملکیت میں لیا جاتا ہے تو سرکاری افسر اس قدر لوٹ مچاتے ہیں کہ نفع کے بجائے اس میں حکومت کو گھاٹا اٹھانا پڑتا ہے۔ اس طوفان بے تمیزی میں اگر کوئی پکڑ لیا جائے اور معاملہ عدالت تک پہنچنے کی نوبت آئے تو وہاں بھی غلط کارروائیاں اور جھوٹی شہادتیں اس کو بچانے کے لئے موجود ہیں۔

غرض قانون اور حقیقت کے درمیان ایک طرح کی آنکھ مچولی ہو رہی ہے جس

میں ناکامی تمام تر قانون کے حصے میں آئی ہے۔

مادی فلسفہ

دوسری چیز جو بہتر سماج کا خواب پورا کرنے کے سلسلے میں انسان کے سامنے تھی وہ مادی خوش حالی ہے۔ اس کا فلسفہ یہ ہے کہ جب لوگوں کی آمدنیاں بڑھ جائیں گی، جب لوگوں کو اپنی ضرورت کی چیزیں فراغت کے ساتھ حاصل ہونے لگیں گی تو وہ کس لئے بدعنوانی کریں گے۔ کس لئے دوسروں کو تکلیف دیں گے، مگر واقعات سے اس نظریے کی تردید ہوتی ہے۔ بلا استثنار تمام ملکوں کا یہ حال ہے کہ وہاں جس رفتار سے مادی ترقی میں اضافہ ہوا ہے اسی نسبت سے جرائم کی رفتار بھی بڑھ رہی ہے۔ میں یہاں اختصار کے خیال سے صرف انٹرنیشنل کریمنل پولس کمیشن کی رپورٹ کا حوالہ دوں گا جس نے دنیا کے ۴۳ ملکوں کے اعداد و شمار جمع کر کے شائع کئے ہیں۔ اس رپورٹ کے مطابق غریب ملکوں میں جرائم کا اوسط ان ملکوں سے بہت کم ہے جو خوش حال ہیں، اور جن کا معیار زندگی بہت بڑھا ہوا ہے۔ برطانیہ میں ۴۶ئہ میں اٹھارہ سال کا ایک لڑکا صرف دو پونڈ ساڑھے سات شلنگ فی ہفتہ کما سکتا تھا۔ لیکن آج پونے چھ پونڈ کما لیتا ہے۔ اور ہوشیار قسم کے نوجوان سات آٹھ پونڈ سے بھی زیادہ کما لیتے ہیں۔ اور پھر انھیں یقین ہے کہ چند سال بعد جب وہ سن بلوغ کو پہنچیں گے تو وہ تیرہ پونڈ فی ہفتہ کی اوسط قومی آمدنی کے مستحق ہوں گے۔

روزگار کے یہ مواقع اور یہ معیار زندگی ہندوستان کے مقابلے میں بہت زیادہ ہیں۔ لیکن مندرجہ بالا اعداد و شمار کے مطابق ۱۹۵۲ئہ میں ہندوستان میں ایک لاکھ آبادی کے درمیان قابل ذکر جرائم کی تعداد ۱۶۵ تھی۔ جب کہ برطانیہ میں اتنی ہی آبادی میں ۱۳۴۲ جرائم ریکارڈ کئے گئے۔ امریکہ جو تمام دنیا میں سب سے زیادہ دولت مند ملک سمجھا جاتا ہے وہاں جرائم کی تعداد ایک لاکھ آبادی میں ۱۳۲۲ تھی۔ (لیڈر ۱۸ فروری ۱۹۵۵ئہ)۔ اور وہاں کے سب سے بڑے تجارتی شہر نیویارک کا تو یہ حال ہے کہ ہر ایک سکنڈ میں شدید جرم کا ایک واقعہ ہوتا ہے۔ جرائم کی اس بڑھتی ہوئی رفتار نے ترقی یافتہ ملکوں میں زندگی کا سکون برہم کر دیا ہے۔ آدمی اس طرح زندگی گزار رہا ہے کہ اس کو اپنا مستقبل غیر یقینی نظر آتا ہے۔ کسی بینک کو نہیں معلوم کہ کب ڈاکوؤں کا ایک گروہ موٹروں اور مشین گنوں سے مسلح ہو کر اس کے اوپر حملہ کر دے گا۔ کسی خاتون کو نہیں معلوم کہ شام کے وقت جب وہ دفتر سے لوٹ رہی ہو گی تو وہ راستہ میں

اغوا کر لی جائے گی یا واپس اپنے گھر پہونچے گی۔ انگلینڈ میں قاتل کے لئے موت کی سزا کو منسوخ کر دیا گیا تھا۔ مگر جرائم کی بڑھتی ہوئی وبا کو دیکھ کر وہاں کے ایک مشہور اہل قلم اور سابق ممبر پارلمنٹ سرایلن ہربرٹ نے مطالبہ کیا ہے کہ سزائے موت کو دوبارہ جاری کیا جائے۔ اور نہ صرف قاتل کو بلکہ چوروں، نقب زنوں اور عورت کی عصمت پر حملہ کرنے والوں کو بھی یہی سزا دی جائے۔

اوپر کی گفتگو سے جہاں مادی نظریات کی ناکامی ثابت ہوتی ہے وہیں یہ بات بھی واضح ہو گئی ہے کہ ان کے اندر وہ کون سا بنیادی خلا ہے جس نے انھیں مکمل ناکامی سے دوچار کیا ہے۔ یہ خلا دراصل محرک کا خلا ہے۔ آپ ایک کارخانے کو صرف بجلی کا بٹن دبا کر حرکت میں لا سکتے ہیں۔ مگر انسان کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ وہ اسی وقت کوئی کام کرتا ہے جب اس کے اپنے اندر اس کے کرنے کا جذبہ پیدا ہو چکا ہو۔ آج دنیا کے پاس زندگی گزارنے کے لئے بہترین قسم کے کاغذی نقشے ہیں اور اس کو عمل میں لانے کے لئے جدید ترین ساز و سامان موجود ہیں۔ مگر یہ سب کچھ صرف اس لئے بے کار پڑا ہوا ہے کہ انسان اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لئے تیار نہیں۔

آج مجرمین کو پکڑنے کی ٹکنیک اتنی ترقی کر گئی ہے کہ اگر کوئی شخص ایک ملک میں جرم کر کے دوسرے مقام پر بھاگ جانے کی کوشش کرے تو اس کے سرحد پار کرنے سے پہلے ریڈیو فوٹو کے ذریعہ ساری دنیا میں اس کا حلیہ نشر کیا جا سکتا ہے۔ لیکن پولس کے افراد اپنی ڈیوٹی صحیح طور پر انجام نہیں دیتے، اس لئے جرم کی روک تھام کے یہ سارے مواقع بیکار ثابت ہو رہے ہیں۔ اقتصادیات اور اعداد و شمار کے ماہرین نہایت کامیاب طریقے پر "کم سے کم خرچ میں زیادہ سے زیادہ فائدہ" حاصل کرنے کے منصوبے بناتے ہیں۔ مگر عملہ کے اندر لوٹ کھسوٹ کی ذہنیت کی وجہ سے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں سے وصول کی ہوئی رقم کم سے کم لوگوں کی جیبوں میں چلی جاتی ہے۔ حکومت کی تشکیل کے لئے نہایت وسیع قسم کے جمہوری طریقے دریافت کئے گئے ہیں۔ مگر لیڈروں اور سیاسی کارکنوں کے غلط استعمال کی وجہ سے جمہوریت عملاً ایک تماشا بن کر رہ گئی ہے۔

ابھی حال میں (اپریل ۱۹۶۰ء) جنوبی کوریا کے الکشن کے بعد اعلان کیا گیا کہ صدارت کے انتخاب میں ڈاکٹر سنگمن رہی کو ۹۰ فی صدی ووٹ ملے ہیں۔ مگر اعلان کے بعد جب عوام نے بغاوت کر دی اور ڈاکٹر رہی کو اپنا صدارتی محل چھوڑ کر بھاگنا پڑا تو معلوم ہوا کہ "۹۰ فی صدی" کی حقیقت اعداد

وشمار کے دھوکے کے سوا اور کچھ نہ تھی۔ سماجی اصلاح کے لئے مستقل محکمے قائم ہیں اور اس کے لئے ایسے ایسے قوانین بنائے گئے ہیں جو انسانی آرزوؤں کی بہترین ترجمانی کرتے ہیں مگر عملاً یہ صرف ان لوگوں کے لئے لوٹ کھسوٹ کا ایک عنوان ہے جو اس کام پر مامور کئے گئے ہیں۔ آج عالمی اتحاد کے نہایت خوبصورت نظرئے کتابوں میں لکھے ہوئے موجود ہیں اور آپس میں تعلق قائم کرنا اتنا آسان ہوگیا ہے کہ آپ ٹیلی فون ریسیور اٹھا کر دنیا کے کسی بھی حصے کے آدمی سے بات کرسکتے ہیں اور ہوائی جہاز سے اڑ کر چند گھنٹے میں کہیں سے کہیں پہنچ سکتے ہیں۔ مگر انسان کے اپنے رویے کی وجہ سے یہ سارا سازوسامان ایک مصیبت ثابت ہو رہا ہے۔ آج سائنس کی بہترین کوششیں صرف ایسے آلات تیار کرنے میں لگی ہوئی ہیں جو دم بھر میں زندہ انسانوں اور آباد شہروں کو ختم کردیں۔

ایک دوسرے کے خلاف شبہات کا یہ حال ہے کہ امریکہ کی اسٹریٹجک ایر کمانڈ کے تین ہزار ہوائی جہاز ہر وقت آسمان میں اڑتے رہتے ہیں تاکہ اپنے ملک کو اچانک حملے سے بچائیں۔ دوسری طرف روس کی سرحدوں پر ہزاروں آدمی نہایت قیمتی آلات اور دوربینیں لئے ہوئے رات دن یہ دیکھتے رہتے ہیں کہ امریکہ کا کوئی جاسوس ہوائی جہاز ان کی سرحد کے اندر تو نہیں گھس آیا ہے۔

محرک کی ضرورت

اس سے معلوم ہوا کہ انسانی بہتری کے لئے آج جس چیز کی ضرورت ہے وہ کوئی قانونی ڈھانچہ یا مادی سازوسامان نہیں ہے بلکہ ایک ایسا نظریہ ہے جو ذمہ داری کا احساس پیدا کرے، جو آدمی کے اندر یہ جذبہ ابھارے کہ وہ اپنی اندرونی تحریک سے صحیح کام کرنے پر مجبور ہو اور غلط سمت میں جانے سے بچے۔ یہ کام صرف مذہب کے ذریعہ ہوسکتا ہے۔ چند سو برس پہلے بڑے جوش سے دعوی کیا گیا تھا کہ زندگی گزارنے کے سلسلے میں انسان کو مذہب کی ضرورت نہیں۔ مذہب حرام وحلال کے کچھ اصول دیتا ہے، وہ ہم اپنے قانون ساز ادارے کے ذریعہ حاصل کرسکتے ہیں۔ مذہب دوسری دنیا کی سزا سے ڈراتا ہے تاکہ لوگوں کے اندر عمل کا جذبہ پیدا ہو، اس کے لئے ہمارا عدالتی نظام اور ہماری جیلیں کافی ہیں۔ مذہب یہ ترغیب دلاتا ہے کہ ہمارے حکموں کو مانو تو تمہاری اگلی زندگی خوش گوار ہوگی۔ اس کے لئے بھی ہم کو موت کا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں۔ اپنی مادی ترقیوں کے ذریعہ ہم اسی دنیا کی زندگی کو جنت بنا سکتے ہیں۔ مگر یہ تمام امیدیں واقعات

کی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو چکی ہیں۔ اور اب انسان دوبارہ اس مقام پر کھڑا ہے جہاں سے اس نے اپنے سفر کا آغاز کیا تھا۔ لمبی مدت تک ٹھوکریں کھانے کے بعد اب انسان کی سمجھ میں یہ بات آئی ہے کہ صرف کاغذی نقشے اور مادی ذرائع و وسائل کافی نہیں ہیں۔ اس کے سوا ایک اور چیز ہے جس کی انسان کو ضرورت ہے۔ وہ ہے خود انسان کا اپنا جذبہ۔ اس کے اندر ایک ایسا ارادہ جو اصلاحات کی خارجی کوششوں سے ہم آہنگ ہونے کے لئے تیار ہو۔ دوسرے لفظوں میں ایک ایسا محرک جو اندر سے آدمی کو عمل پر اکسائے، جو آدمی کو ایک دوسرے کے حقوق پہچاننے پر مجبور کرے۔

یہی اندرونی محرک تمام اصلاحات کی جان ہے۔ اگر یہ موجود نہ ہو تو ساری ترقیوں کے باوجود آپس میں اس قدر چھین جھپٹ ہوگی کہ زندگی سکون سے محروم ہو جائے گی اور بہترین قسم کے معاشی منصوبے صرف ٹھیکیداروں اور انجینئروں کے لئے لوٹ کھسوٹ کا موقع ثابت ہوں گے۔

مگر تمام نظریات میں صرف مذہب ہی کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ آدمی کے اندر اس قسم کا اندرونی محرک پیدا کر سکے۔ انسانی قانون بدعنوانی سے روکنے کے لئے زیادہ سے زیادہ کسی عدالت میں پیشی کا حوالہ دے سکتا ہے جس کے متعلق معلوم ہے کہ جھوٹے بیانات اور غلط شہادتوں کے ذریعہ بہت آسانی سے اس کو گمراہ کیا جا سکتا ہے۔ جب کہ مذہب قادر مطلق کی عدالت میں حاضر ہونے سے ڈراتا ہے جس سے بچنا کسی حال میں ممکن نہیں ہے۔ اس لئے انسانی ساخت کا نظام کبھی بھی کوئی بہتر سوسائٹی تعمیر نہیں کر سکتا۔ یہ صرف مذہب ہی کے ذریعہ ممکن ہے۔ لینن نے مذہب کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا تھا کہ "ہمارے نزدیک آسمان پر جنت تعمیر کرنے سے زیادہ اہم کام زمین پر جنت تعمیر کرنا ہے۔" مگر تجربے نے ثابت کر دیا کہ زمین پر وہی لوگ جنت تعمیر کر سکتے ہیں جو آسمان پر جنت تعمیر کرنے کا مقصد اپنے سامنے رکھتے ہوں۔ اور جن کے پیش نظر آسمان پر جنت کی تعمیر نہ ہو وہ زمین و آسمان دونوں جگہ صرف دوزخ کی تعمیر کریں گے۔

مذہب کے بارے میں یہ تصور محض ایک ذہنی اپج یا خوش عقیدگی نہیں ہے بلکہ یہ ایک تاریخی حقیقت کو تسلیم کرنا ہے۔ پچھلی صدیوں کی تاریخ بتاتی ہے کہ کروروں انسان اس امید میں نیکی کی راہ چلے ہیں کہ انھیں اس کا بدلہ آنے والی زندگی میں ملے گا۔ اور بے شمار لوگ محض اس خوف سے بدی سے بچتے رہے ہیں کہ کہیں ان کی بداعمالیاں انھیں عذابِ دائمی کے

حوالے نہ کردیں۔ مگر مادی دور میں اس قسم کی مثال پیش نہیں کی جا سکتی۔ آج اگر کوئی انسان بھلائی کی راہ پر چلتا ہوا نظر آتا ہے تو وہ بھی دراصل پرانے مذہبی تصورات ہی کا اثر ہے۔ ورنہ جہاں تک مادی تہذیب کا تعلق ہے وہ تو انسان کو خود غرض اور غیر ذمہ دار بنانے کے سوا اور کوئی صلاحیت نہیں رکھتی۔

اس صورت حال نے تمام دنیا کے سنجیدہ انسانوں کو سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اب یہ حقیقت لوگوں کی سمجھ میں آنے لگی ہے کہ اصل مسئلہ انسان کا ذہن بدلنا ہے نہ کہ قانون اور معیار زندگی کو بدلنا۔ خود وہ ممالک جو مادیت کا گڑھ ہیں وہاں بھی ایسے لوگ اٹھ رہے ہیں جو بڑی شدت کے ساتھ اس ضرورت کو محسوس کرتے ہیں۔ چنانچہ دوسری جنگ عظیم کے بعد مغربی ملکوں سے جو کتابیں شائع ہو رہی ہیں ان میں بار بار اس قسم کے فقرے دہرائے جا رہے ہیں کہ "اگر نوع انسانی اپنی خیریت چاہتی ہے تو اس کو لازماً کلچر کے ایک روحانی استحکام کی طرف پلٹنا ہوگا۔" "اب اخلاقی انضباط کا دوبارہ حصول اور روحانی نظام کی طرف واپسی انسانی بقا کے لئے ناگزیر شرط کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔" آج ایک نئی روحانی شیرازہ بندی کی ضرورت ہے۔ جس کے ذریعہ اخلاق اور کلچر کے درمیان وہ مرکزی تعلق بحال ہو جائے جو انسانی ارتقار کی ہر سطح پر اور ہر دور میں موجود رہا ہے۔" (کرسٹوفر ڈاسن)۔ ان باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ انسان کو اصل ضرورت کا احساس ہو چکا ہے مگر اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے عام طور پر جن عملی شکلوں کا ذکر کیا جاتا ہے وہ یا تو غلط ہیں یا ناقص ہیں۔

دیوار کی ضرورت

غلط شکل سے میری مراد وہ تجویزیں ہیں جو اس امید میں پیش کی جا رہی ہیں کہ محض اخلاقی اپیلوں کے ذریعہ آدمی کے اندر اس قسم کا احساس پیدا کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علم بردار وہ لوگ ہیں جو مذہب میں عقیدہ نہیں رکھتے مگر اخلاق کی ضرورت بھی تسلیم کرنے پر مجبور ہیں۔ اس لئے چاہتے ہیں کہ کوئی ایسا طریقہ دریافت ہو جائے کہ مذہب کی دیوار سے مدد لئے بغیر اخلاق کی چھت کھڑی ہو جائے۔ ہندوستان کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو اسی گروہ کی ایک مثال ہیں۔

۱۹۵۶ء کا واقعہ ہے۔ میک گل یونیورسٹی میں سیاسیات کے استاد پروفیسر مائیکل بریچر نے ایک انٹرویو کے دوران ان سے سوال کیا۔ "کیا آپ مختصر طور پر مجھے بتائیں گے کہ آپ

کے نزدیک اچھے سماج کے لئے کیا کیا چیزیں ضروری ہیں۔" وزیر اعظم نے جواب دیا۔

"میں کچھ معیاروں کا قائل ہوں، وہ ہر فرد اور ہر سماجی گروپ کے لئے ضروری ہیں اور اگر وہ معیار باقی نہ رہیں تو تمام مادی ترقی کے باوجود آپ کسی قابل قدر نتیجے پر نہیں پہنچ سکتے۔ مجھے نہیں معلوم کہ ان معیاروں کو کس طرح برقرار رکھا جائے۔ ایک تو مذہبی طریقہ ہے۔ لیکن یہ اپنے تمام رسوم و تقریبات کے ساتھ مجھے تنگ نظر آتا ہے۔ میں اخلاقی اور روحانی قدروں کو مذہب سے علیحدہ رکھ کر بڑی اہمیت دیتا ہوں۔ لیکن میں نہیں جانتا کہ ان کو ماڈرن زندگی میں کس طرح قائم رکھا جاسکتا ہے۔"

ان فقروں میں پنڈت نہرو نے اپنے طبقے کے لوگوں کی نہایت صحیح ترجمانی کی ہے۔ جو لوگ مذہب سے الگ رہ کر اخلاقی قدروں کو زندہ کرنا چاہتے ہیں،ان کی مشترک خصوصیت یہ ہے کہ وہ سب کے سب بے یقینی میں مبتلا ہیں۔ وہ خود اپنے مقدمے کی کمزوری تسلیم کرتے ہیں۔ وہ ایک چیز کی ضرورت محسوس کرتے ہیں مگر انہیں نہیں معلوم کہ وہ انسانوں سے اسے کس طرح منوائیں۔ انھیں اپنے خیالات کی کوئی بنیاد نظر نہیں آتی۔

کھلی ہوئی بات ہے کہ جب ایک شخص کوئی بدعنوانی کرتا ہے تو اس لئے کرتا ہے کہ اس میں اسے اپنی تمنائیں پوری ہوتی ہوئی نظر آتی ہیں وہ اس کو اپنی ترقی اور کامیابی کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ اس میں اسے عزت اور دولت پانے کی توقع ہوتی ہے۔ پھر آخر کس لئے وہ اسے چھوڑ دے گا۔ کیا محض اس لئے کہ کچھ لوگ اسے اخلاق اور انسانیت کے خلاف سمجھتے ہیں۔ کیا محض کسی کے اپدیش کی خاطر کوئی شخص ایسا کرسکتا ہے کہ نفع کے بجائے نقصان کو اپنے لئے قبول کرلے۔

حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ انسانیت (مانوتا) کے نام پر لوگوں کو اخلاقیات کا پابند بنانا چاہتے ہیں وہ ہوا میں عمارت کھڑی کررہے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ ایسی عمارت کبھی وجود میں نہیں آسکتی۔

ایک مثال لیجئے۔ ہندوستانی ریلوں پر ہر بیس مسافروں میں سے ایک آدمی بلاٹکٹ سفر کرتا ہے اور اس طرح مرکزی خزانے کو تقریباً پانچ کرور روپے سالانہ کا مسلسل نقصان ہورہا ہے۔ اس وبا کی روک تھام کے لئے ملک بھر میں بارہ ہزار سات سو اشخاص ملازم ہیں جن پر ہر سال دو کرور انیس لاکھ روپیے صرف ہوتے ہیں۔ جب ہزاروں آدمیوں کا یہ عملہ

اور سالانہ سوا دو کرور روپیے کا خرچ بلاٹکٹ سفر کو روکنے میں کامیاب نہیں ہوا تو حکومت نے ایک اخلاقی تدبیر سوچی۔ حکومت کی طرف سے ایک خاص پوسٹر چھپوا کر تمام اسٹیشنوں پر لگا دیا گیا۔ جس پر لکھا ہوا تھا۔ Ticketless travel is a social evil یعنی بے ٹکٹ سفر کرنا سماجی گناہ ہے۔ مگر اس کا حاصل اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوا کہ کرایہ وصول نہ ہونے کی وجہ سے حکومت کو جو کچھ نقصان ہو رہا تھا اس میں اس پروپگنڈے کے اخراجات کا مزید اضافہ ہو گیا۔ اصل صورت حال بدستور اپنی جگہ باقی رہی۔

اس طرح کی بے شمار مثالیں ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ نقطۂ نظر بار بار کے تجربے میں قطعی طور پر ناکام ثابت ہو چکا ہے۔ مگر کس قدر حیرت کی بات ہے کہ اس کے باوجود ساری دنیا میں اخلاق کی اسی خیالی بنیاد پر تعمیرات کا سلسلہ جاری ہے۔ آج جو منصوبے بن رہے ہیں، جو سیاسی اور سماجی ڈھانچے کھڑے کیے جا رہے ہیں۔ وہ سب اس مفروضے پر مبنی ہیں کہ افراد اور سرکاری عملہ اس کی تکمیل میں اپنا حصہ صحیح طور پر ادا کریں گے۔ اس کے بغیر کسی اسکیم کی کامیابی کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ مگر حالات پکار رہے ہیں کہ یہ امیدیں بالکل فرضی ہیں۔

اس کے لئے کالج کے طلبہ کی مثال کافی ہوگی۔ کالجوں میں جو لوگ پڑھتے ہیں ان کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ وہ آج کے شہری اور کل کے سرکاری لوگ ہیں۔ ان کی زندگی میں ہم بیک وقت دونوں کردار دیکھ سکتے ہیں۔ ان طلبہ کو اخلاق اور تہذیب سکھانے کے لئے کروروں روپیے صرف کئے جا رہے ہیں مگر ان کا حال یہ ہے کہ سال بھر کھیل کود میں گزارتے ہیں اور جب امتحان آتا ہے تو پرنسپل کو پستول دکھا کر پرچہ آؤٹ کر لیتے ہیں۔ ان کی آزادی بلکہ آوارگی اس قدر بڑھ گئی ہے کہ ناچ گانے کی ایک تقریب میں شرکت کے لئے اگر انھیں رعایتی پاس نہ ملے تو وہ اس قدر اودھم مچاتے ہیں کہ پولس کو گولی چلانی پڑتی ہے اور سارے شہر میں کرفیو نافذ ہو جاتا ہے۔

کیا یہی وہ لوگ ہیں جن کے بل پر ہمارے سیاسی لیڈروں نے بڑی بڑی اسکیمیں بنائی ہیں اور اس کے لئے اربوں روپئے کے ٹیکس ملک کے اوپر لاد رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ سماج اور موجودہ سرکاری مشنری دونوں کسی قومی ذمہ داری کو اٹھانے کے بالکل نااہل ہو چکے ہیں۔ سڑکوں پر سے مین ہول کے ڈھکن کا غائب ہو جانا سماج کی طرف سے اس بات کا انتہائی اعلان ہے کہ وہ آپ کی کسی اسکیم کے ساتھ تعاون کرنے کے لئے تیار نہیں۔ سرکاری عملہ

کے اندر رشوت اور ناکردگی کی بڑھتی ہوئی وبا صاف بتا رہی ہے کہ جن ہاتھوں سے کام لیا جانے والا ہے وہ ہاتھ مفلوج ہو چکے ہیں۔ آج کے انسان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ صرف اس چیز کو مانتا ہے جس کی صداقت تجربے سے ثابت ہو گئی ہو۔ مگر یہی انسان ایک ایسے عمل پر اب تک اصرار کئے چلا جا رہا ہے جس کو تجربہ رد کر چکا ہے اور جس کے حق میں نظری استدلال تو کبھی موجود ہی نہیں تھا۔

عیسائیت

دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جن کی امیدوں کا مرکز مذہبی تعلیمات ہیں ان میں ایک تو عیسائیت کو ماننے والے ہیں جو بڑے زور شور کے ساتھ اپنے مذہب کو ان مسائل کے حل کی حیثیت سے پیش کر رہے ہیں۔ یورپ اور امریکہ میں عیسائی مصنفین کی اچھی خاصی تعداد نے اسی قسم کے مضامین لکھنے کو اپنا مستقل موضوع بنا لیا ہے۔ ان میں بعض چوٹی کے مفکرین بھی شامل ہیں۔ اس مقصد کے لئے اجتماعی کوششیں بھی ہو رہی ہیں۔ مثلاً سوئزرلینڈ سے ایک تحریک اٹھی ہے جس کا نام ہے اخلاقی اسلحہ بندی (Moral Re-armament) اس کے بانی ڈاکٹر فرینک بک مین ہیں۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ خدا پرستی کے تحت اخلاقی قدروں کو رواج دیا جائے اور لوگوں کے سوچنے کے انداز میں تبدیلی پیدا کی جائے۔ خاص طور پر ایمانداری، پاکیزگی، بے غرضی، باہمی خیر خواہی اور محبت کو پھیلایا جائے۔ اسی طرح امریکہ میں خاص اسی مقصد کیلئے ایک ادارہ (Research Centre in Creative Altruism) کے نام سے ۱۹۴۹ء سے قائم ہے جس کو ایک پبلک فنڈ سے پندرہ ہزار ڈالر سالانہ کی امداد ملتی ہے۔ اس ادارے کے ڈائریکٹر پروفیسر سوروکن (Sorokin) ہیں۔ ۱۹۴۱ء میں انہوں نے پہلی بار اپنے تحقیق و مطالعہ کے نتائج پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ اس وقت سب سے اہم کام انسان کے اندرون یا اس کے نفس کی اصلاح ہے۔ جس پر تمام تر خود غرضی کا تسلط ہو گیا ہے۔ اور یہ ضروری ہے کہ اس کے برعکس اس میں بے لوث محبت کے اس جذبے کو پیدا کیا جائے اور ابھارا جائے جو آفاقی ہو۔ فرد کی اصلاح کے بغیر جو انقلاب بھی لایا جائے گا وہ بالکل سطحی ہوگا اور ساری کوششیں رائگاں جائیں گی۔ موجودہ حالات کا علاج تجویز کرتے ہوئے وہ اپنی کتاب (Crisis of our Age) میں لکھتے ہیں:

"انسان کی پوری ذہنیت اور اس کے جملہ رجحانات میں اس تبدیلی کی ضرورت ہے

جس کا رخ ان اصولوں کی طرف ہو جس کو پہاڑی کے وعظ[1] میں پیش کیا گیا تھا۔ جب اس قسم کی تبدیلی ایک خاص حد تک ہو چکی ہوگی" اس کے بعد ہی یہ ممکن ہے کہ اس نہج پر سیاسی اور اقتصادی شعبوں میں بآسانی تبدیلی ہو سکے۔ لیکن اس تبدیلی کے بغیر کتنی ہی سیاسی اور اقتصادی بہتری اور میکانکی نوعیت کی تعمیر کیوں نہ کی جائے اس سے خاطر خواہ نتائج پیدا نہیں ہوں گے۔"

ہندوازم

اس قسم کے مذہبی لوگوں میں دوسرا قابل ذکر گروہ جدید ہندو مفکرین کا ہے۔ سی راجگوپال اچاریہ نے خاص اسی موضوع پر ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے۔ *Hinduism: Doctrine and Way of Life* اس کتاب میں انہوں نے دکھایا ہے کہ آج کی دنیا کچھ روحانی تہذیبی بنیادوں کی طالب ہے اور وہ اخلاق اور کلچر جس کی جڑیں ویدانت میں اتری ہوئی ہیں، بلاشبہ اس ضرورت کو پوری کر سکتا ہے۔ "صنعتی انقلاب نے جو مسائل پیدا کئے ہیں، عمل اور اخلاقی قدروں کے درمیان آج جو علیحدگی نظر آتی ہے، سوسائٹی کے خود غرض عناصر جس طرح قانون کے ذریعہ استحصال کی کوشش کر رہے ہیں اور سیاسی اور معاشی میدانوں میں اس کو ناجائز کامیابی کے لئے استعمال کرتے ہیں، متضاد مقاصد کے درمیان انسانی طاقت جس بری طرح ضائع ہو رہی ہے، ان تمام خرابیوں کا ذکر کرنے کے بعد وہ سوال کرتے ہیں کہ کیا دنیا کو ایک ایسا مذہب پیش کیا جا سکتا ہے جو سائنس کا مخالف نہ ہو اور عملی زندگی اور ریاستی معاملات کو حق پرستی کی بنیاد پر تعمیر کر سکے۔ اور اس کے بعد خود ہی کہتے ہیں کہ Vedanta is the answer یعنی ویدانت اس سوال کا جواب ہے۔" واضح لفظوں میں" وہ لکھتے ہیں" دعویٰ یہ ہے کہ ایک اخلاقی کوڈ اور اقدار کا ایک نظام ہندو مفکرین نے مذہبی فلسفے سے

---

[1] پہاڑی کا وعظ حضرت مسیح علیہ السلام کی ایک خاص تقریر ہے جو انجیل کی پہلی کتاب میں پانچویں، چھٹے اور ساتویں باب میں درج ہے۔ اس میں نہایت مؤثر انداز میں خدا پرستی اور اعلیٰ اخلاقیات کی تعلیم دی گئی ہے۔ راست بازی، رحم دلی، باہم صلح کرانا، صبر کرنا، حق کی روشنی پھیلانا، ناحق خون نہ کرنا، کسی کو تکلیف نہ دینا، لوگوں کے حقوق ادا کرنا، عورت کی عصمت پر حملہ نہ کرنا، جھوٹ نہ بولنا، زیادتی کا جواب نرمی سے دینا، ریا و نمائش سے بچنا، مال کی حرص نہ کرنا، اور عیب جوئی سے بچنا یہ اس کے چند خاص اجزاء ہیں۔

تیار کیا ہے جس کو دیدانت کہا جاتا ہے جو نہ صرف یہ کہ سائنس کے مطابق ہے بلکہ ایک بہتر اور مستحکم سماجی تنظیم کی نہایت عمدہ اور موزوں بنیاد بن سکتا ہے جس کی تمام دنیا کے بہترین لوگ تمنا رکھتے ہیں اور اس کے لئے کوشش کر رہے ہیں۔"

ہندوازم موجودہ ترقی یافتہ سماج کی ضرورتوں کو کس طرح پورا کر سکتا ہے اس کی ایک مثال دیتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

بھاگود گیتا میں یہ بات نہایت واضح طریقے پر بیان کر دی گئی ہے کہ آدمی کو چاہئے کہ وہ اپنے عمل اور سماجی ذمہ داریوں کو اپنی حیثیت کے مطابق انجام دے، نہ کہ منافع کی غرض سے، ہم کو اب سماجی اور اقتصادی مصلحین بتا رہے ہیں کہ اسٹیٹ اس بات کی نگرانی کرے گی کہ مرد اور عورت محض اپنے ذاتی مقاصد کے لئے کام نہ کریں۔ بلکہ اجتماعی مفاد کو بھی سامنے رکھیں۔ اور یہ بالکل وہی بات ہے جو بھاگود گیتا میں کہی گئی ہے .... اس میں نہایت واضح طریقے پر بار بار بتایا گیا ہے کہ تمام کام دیانت داری اور بے غرضی کے ساتھ اجتماعی بہبود (لوک سنگرہ) کے لئے کیا جائے نہ کہ شخصی تمناؤں کی تسکین کے لئے۔ درحقیقت گیتا نے تمام سوشلسٹ اصولوں کو نہایت عمدہ طریقے پر پیش کر دیا ہے۔ صفحات ــ ۲۲ ـ ۲۳

دونوں مذاہب پر تبصرہ

عیسائیت اور ہندوازم کی طرف سے جو دعویٰ کیا گیا ہے اس کو میں بالکل بے بنیاد نہیں کہتا۔ مگر یقینی طور پر میں اس کو نہایت ناقص حل سمجھتا ہوں۔ یہ صحیح ہے کہ انجیل اور وید میں اخلاق کے اعلیٰ اصول لکھے ہوئے ملتے ہیں۔ مگر انسان کو جس چیز کی ضرورت ہے وہ محض اخلاقیات کی ایک فہرست نہیں ہے۔ اس قسم کی فہرست کا علم انسان کو بہت پہلے سے ہے اور اس سلسلے میں شاید ہم انسانی معلومات میں کوئی خاص اضافہ نہیں کر سکتے۔ آج انسان کو دراصل ایک ایسے محرک کی ضرورت ہے جو ان معلوم اخلاقیات پر عمل کرنے کے لئے ابھارتا ہو۔ وہ اس کے اندر ایسا مضبوط داعیہ پیدا کرے کہ جو کچھ وہ جانتا ہے اس کو وہ کرنے لگے اور اس لحاظ سے دونوں مذاہب تقریباً خالی ہیں۔

مگر یہ خالی ہونا اس نوعیت کا نہیں ہے جیسا کہ اوپر ہم نے "اخلاق کے نام پر اخلاق" پیدا کرنے والوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔ یہ مذاہب جس طرح اخلاق کے کچھ اصول بتاتے ہیں۔ اسی طرح ان کی تعلیمات میں یہ بات بھی شامل ہے کہ جو ان پر عمل نہیں کریگا

وہ اس کے لازمی نتیجے کے طور پر ایک برے انجام سے دوچار ہوگا۔ دونوں مذہبوں میں زندگی بعد موت کا تصور موجود ہے اور دونوں مرنے کے بعد کسی نہ کسی شکل میں اچھے یا بُرے انجام کی خبر دیتے ہیں۔ یہی دراصل وہ چیز ہے جو آدمی کو بدعنوانیوں سے روکنے والی ہے۔ یہ تصور وہاں بھی آدمی کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے جہاں کوئی اس کا ہاتھ پکڑنے والا نہیں ہوتا۔ اس طرح ان مذاہب میں وہ قدر بنیادی طور پر موجود ہے جس کو اوپر ہم نے محرک عمل کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ اس کا ایک کھلا ہوا ثبوت خود ان مذاہب کی تاریخ میں موجود ہے۔ سابق دور میں ان مذاہب کی بنیاد پر جو سوسائٹی بنی تھی وہ اخلاقی اعتبار سے صریح طور پر موجودہ مادہ پرست سوسائٹی سے بہتر تھی۔ مگر ان مذاہب کے ماننے والوں نے اپنے مذہب کو صحیح شکل میں محفوظ نہیں رکھا اور ان کی تعلیمات اب جس شکل میں ہمارے سامنے موجود ہیں وہ اس قدر ناقص اور الجھی ہوئی ہیں کہ کسی وسیع اور پائدار اصلاح کی بنیاد نہیں بن سکتیں۔

عیسائیت کا حال یہ ہے کہ جس انجیل میں پہاڑی کا وعظ ہے اسی میں مسیحی مذہب کا یہ عقیدہ بھی درج ہے کہ نجات کے لئے کسی عمل کی ضرورت نہیں۔ صرف یسوع مسیح پر ایمان لانا کافی ہے۔ اس نظرئے کے مطابق ساری دنیا خدا کے نزدیک سزا کے لائق ہے۔ کیونکہ سب نے گناہ کیا اور خدا کے جلال سے محروم ہوگئے۔ اس لئے خدا نے اپنے بیٹے کو دنیا میں بھیجا اور اس کو سولی پر چڑھا کر "اس کے خون کے باعث ایک ایسا کفارہ ٹھہرایا" جس کو مان کر دوسرے لوگ اپنے گناہ بخشوالیں۔ اب نجات کے لئے عمل کی ضرورت نہیں۔ بلکہ صرف "خدا کے بیٹے" کی اس حیثیت کو تسلیم کرنا کافی ہے۔ کیونکہ "انسان شریعت کے اعمال کے بغیر ایمان کے سبب سے راستباز ٹھہرتا ہے۔" (نئے عہد نامے کی چھٹی کتاب، باب ۳) ایسی حالت میں کوئی شخص آخر کس لئے عمل کے جھنجھٹ میں پڑے گا۔ کفارہ کا عقیدہ تسلیم کرنے کے بعد وہ کون سا محرک ہے جو آدمی کو نیکی کے لئے ابھارے اور برائی سے روکنے پر مجبور کرے۔

انجیل کا یہ تضاد ہمارے نزدیک سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی اصل تعلیم کا تضاد نہیں ہے۔ مگر آج عیسائیت کے نام سے جو چیز موجود ہے وہ قطعی طور پر یہی ہے۔ آں جناب نے تو مذہب کو اس کی صحیح ترین شکل میں پیش کیا تھا۔ مگر آپ کے ماننے والے آپ کی تعلیمات کو محفوظ نہ رکھ سکے۔ دوسروں کی تشریح و تعبیر میں شامل ہو کر اصل حقیقت گم ہوگئی۔ انجیل کو دیکھئے تو ایک طرف اس میں بہترین مؤثر انداز میں آخرت کا ذکر اور اعلیٰ اخلاقیات کی تعلیم

ملے گی۔ جس کو پڑھ کر آدمی کی روح بیدار ہوتی ہے اور اس کے اندر عمل کا جذبہ پیدا ہوتا ہے مگر اس کے بعد جب وہ اگلے صفحات میں سینٹ پال کا فلسفہ پڑھتا ہے تو اس کو یہ تمام چیزیں بے ضرورت معلوم ہونے لگتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کفارہ کے عقیدے نے عیسائی مذہب میں عمل کی بنیاد کو اسی طرح کمزور کر دیا ہے جیسے کسی ملک کے دستور میں یہ لکھ دیا جائے کہ اگرچہ یہاں پولس اور عدالت کا نظام قائم رہے گا مگر کسی کو اس کی غلط روی پر سزا نہیں دی جائے گی۔ کیونکہ آدمی پاک باز رہنے پر قادر نہیں ہے۔

ہندو مذہب کا معاملہ بھی تقریباً یہی ہے۔ بظاہر وہ صرف اخلاقی اپیل نہیں کرتا بلکہ سزا اور انعام کا بھی ایک نظریہ اپنے پاس رکھتا ہے جس کو "کرم" کہتے ہیں، یعنی اپنے کیئے کا پھل پانا۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ نظریہ بھی اپنی ابتدائی شکل میں ایک صحیح نظریہ ہوگا۔ مگر اب تو وہ نہایت ناقص صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ ہندو مذہب پر فلسفہ کا جو لمبا دور گذرا ہے۔ غالباً اس زمانے میں لوگوں کی ذہنی موشگافیوں نے اس کی ہیئت بدل دی۔ اور ایک صحیح چیز نے غلط شکل اختیار کر لی۔ اب یہ نظریہ جس صورت میں ہمارے سامنے ہے اس کو آواگون یا پنر جنم کہتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی جیسا عمل کرتا ہے اسی کے لحاظ سے وہ اگلے جنموں میں اچھے یا برے جسم میں پیدا ہوتا ہے اور پیدائش کا یہ چکر برابر چلتا رہتا ہے۔ اس عقیدے کی رو سے آج جو وجود انسان، حیوان، پرند، درخت، سبزی گھاس یا کیڑے مکوڑے کی شکل میں نظر آ رہا ہے وہ سب پچھلے اعمال کے نتیجے میں ہے۔ پنر جنم کا یہ نظریہ معمولی اختلاف کے ساتھ ہندو مذہب کی تمام شاخوں میں تسلیم کیا جاتا ہے۔

اس نظریے کے اوپر بھی ہماری تنقید وہی ہے جو عیسائیت کے سلسلے میں ہم لکھ چکے ہیں۔ یعنی اس کے اندر جو محرک ہے وہ نہایت ناقص اور محدود ہے۔ وہ آدمی کے اندر کوئی ایسا زوردار داعیہ پیدا نہیں کرتا جس کی رغبت سے وہ اچھائی کی طرف لپکے اور جس کا ڈر اسے برائیوں سے روکنے پر مجبور کرے۔ فرض کیجئے ایک کلرک کو ایک غلط کام کے لئے پچاس ہزار روپئے رشوت میں مل رہے ہیں۔ کیا صرف اس لئے وہ ملتے ہوئے فائدے کو چھوڑ دے گا کہ مرنے کے بعد جب اس کا دوسرا جنم ہوگا تو اس میں وہ مچھر مکھی ہو جائے گا یا آم اور ببول کی شکل میں پیدا ہوگا۔ اینٹی کرپشن قانون کے تحت ملنے والی سزا کا خوف

اگر اس کو اس عمل سے نہیں روکتا تو اگلے جنم میں کیڑا مکوڑا یا درخت بن جانے ہیں وہ کون سی ہولناکی ہے جو آدمی کو لرزا دے اور اس کو جرم سے باز رکھے۔ اس نظریے کے مطابق وحشیانہ جرائم کی ایک بہت بڑی سزا جو منوسمرتی میں بتائی گئی ہے وہ یہ کہ ایسا آدمی دوسرے جنم میں چنڈال کے گھر میں پیدا ہوگا۔ چنڈال سے مراد پاسی، ملاح، دھوبی، ڈوم، چمار وغیرہ ہیں۔ ممکن ہے کہ کسی زمانے میں ان قوموں کی یہ حالت رہی ہو۔ مگر اب تو ان کا لقب ہریجن (خدا والے) ہے۔ ان کو وقت کے دستور میں دوسرے انسانوں کے برابر درجہ حاصل ہے۔ اور ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جو بنگلوں اور کاروں میں زندگی گذارتے ہیں۔ حتیٰ کے ایک اچھوت لیڈر اگر الکشن میں جیت جائے تو وہ وزارت کا عہدہ حاصل کرکے برہمن آبادی کے اوپر حکومت کرتا ہے اور ان کے لئے قانون بناتا ہے۔ آخر اس طرح کے انجام میں وہ کون سا بھیانک پن ہے جو کسی کو جرم سے روکنے کا سبب بن سکے۔

اور بالفرض اگر اس سزا کی کوئی ایسی تعبیر کی جائے جس میں وہ بھیانک نظر آنے لگے تو اس کے بعد بھی اس کے اندر ایک ایسا خلا باقی رہتا ہے جو آدمی کے جذبات کو سرد کرنے کے لئے کافی ہے۔ اگر آپ ایک تباہ حال آدمی کو لیں اور اس سے پوچھیں کہ تم نے اپنے پچھلے جنم میں کیا کیا تھا جس کے نتیجے میں یہ انجام بھگت رہے ہو تو وہ کچھ نہ بتا سکے گا حقیقت یہ ہے کہ ہم میں سے کسی کو یہ بھی نہیں معلوم کہ ہم اس سے پہلے دنیا میں آئے بھی تھے یا نہیں۔ پنر جنم کے عقیدے کے مطابق انسان کو اس کے عمل کا بدلہ دینے کا معاملہ بالکل بے خبری میں انجام پاتا ہے اور یہ بے خبری پنر جنم کی تمام شکلوں میں موجود ہوتی ہے۔ جن احساسات رکھنے والے ایک وجود نے اپنی زندگی میں ایک کام کیا تھا۔ اس کو جب اپنے اس عمل کا انجام ملتا ہے تو وہ اپنے پچھلے وجود کو بھول چکا ہوتا ہے۔ کیا ایسے ایک واقعہ کو سزا کہا جا سکتا ہے۔ یہ تو بالکل ایسی ہی بات ہے جیسے بے ہوشی کا انجکشن دے کر کسی کی چیر پھاڑ کی جائے۔ بلکہ زیادہ ٹھیٹ لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہے کہ میرے آج کے عمل کا بدلہ کل دوسرے شخص کو ملے گا اور میری آج کی بداعمالیوں کی سزا کل کسی اور کو بھگتنی پڑے گی۔ مرنے کے بعد جب میں اپنے موجودہ شعور اور موجودہ احساسات کے ساتھ ختم ہو جاؤں گا تو اس کے بعد کی پیدائش کو میری پیدائش کیوں کہا جائے۔ پھر جس عمل کا انجام میرے بعد

دوسرے انسان کو ملنے والا ہے اس کے لئے آخر میں کیوں کوشش کروں اور جس بد عملی کی سزا دوسرے وجود کو بھگتنی ہے اس سے میں کیوں ڈروں ۔ پنر جنم میں روح کے قالب بدلنے کو جس شکل میں پیش کیا گیا ہے ممکن ہے اس کو منطقی استدلال اور فلسفیانہ بحثوں کے ذریعہ ایک انسان کا مختلف جنم قرار دیا جا سکے مگر قطعی طور پر یہ ایک لفظی استدلال ہوگا ۔ حقیقت کے اعتبار سے یہ بات بالکل ناقابل فہم ہے کہ اس طرح کے مختلف جنموں کو ایک انسان کا جنم کس بنا پر کہا جاتا ہے ۔

اسی طرح اس نظریے کے اندر انسانی کامیابی کا جو تصور دیا گیا ہے اس میں بھی ہمارے لئے کوئی کشش نہیں ہو سکتی ۔ پنر جنم کے مطابق انسان کی کامیابی یہ ہے کہ اس کی روح مختلف قالبوں میں پیدا ہو کر ارتقار کرتی رہے یہاں تک کہ بالآخر خدا یا پرماتما کے وجود میں گم ہو جائے جس کو نجات یا نروان کہا جاتا ہے ۔ یہاں مجھے اس نظریے کے علمی اور فلسفیانہ پہلوؤں سے بحث نہیں ہے ۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس طرح کے ایک نظریے میں وہ کون سی کشش ہے جس کے لئے آدمی دنیا کے دکھ جھیلے اور زندگی بھر خواہ مخواہ ذمہ داریاں پوری کرنے اور حقوق ادا کرنے کا کھڑاگ اپنے سر مول لے ۔ اس کامیابی میں انسان کو کیا ملا ۔ اس کو زیادہ سے زیادہ پرماتما کی اپنی تکمیل کہا جا سکتا ہے نہ کہ کسی انسان کا ارتقار ۔ پھر جس عمل کا فائدہ تمام تر دوسرے کو ملنے والا ہو اس میں آدمی کیوں محنت کرے ۔ ممکن ہے کچھ مخصوص قسم کے فلسفیانہ ذوق رکھنے والے لوگوں کو اس طرح کے نامعلوم ارتقار سے دلچسپی ہو ۔ مگر عام انسان جن جذبات اور جن تمناؤں کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے اس کے لئے اس میں کوئی کشش نہیں ہو سکتی اور صرف یہ واقعہ فلسفۂ نروان کے خلافِ فطرت اور خلافِ واقعہ ہونے کا کافی ثبوت ہے ۔

اسلام

اس مختصر جائزے کے بعد اب ہم اس مقام پر پہنچ گئے ہیں جہاں یہ فیصلہ کرنا آسان ہے کہ نوع انسانی کی فلاح و بہبود کے لئے کون سا دھرم سب سے بہتر ہے ۔ اس کا جواب اسلام کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا ۔ کیونکہ وہ تمام خصوصیات اس کے اندر مکمل ترین شکل میں موجود ہیں جو ایسے ایک دھرم میں ہونا ضروری ہیں ۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اسلام کی طرف سے میں کسی ایسی چیز کا انکشاف کرنے والا ہوں جس کی

بقیہ دنیا کو اب تک خبر نہیں تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کی یہ حیثیت اپنے اصول کے نئے پن کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ صرف اس لئے ہے کہ جو کچھ دوسروں کے پاس بگڑی ہوئی شکل میں ہے وہ اس کو صحیح اور بے آمیز شکل میں پیش کرتا ہے۔ خدا اور آخرت کا تصور جو دوسرے مذاہب میں موجود ہے، یہی اسلام کے حل کی اصل بنیاد ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ دوسرے مذاہب میں یہ حقیقت صدیوں کے گرد و غبار میں چھپ گئی تھی اور اسلام نے اس کو تمام ملاوٹوں سے صاف کر کے خالص شکل میں ہمارے سامنے رکھا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اسلام کی طرف دنیا کو ہم جو بلا رہے ہیں اس کی بنیاد یہ نہیں ہے کہ اسلام کوئی نئی اور انوکھی چیز ہے جو ابھی تک کسی کو معلوم نہیں تھی۔ بلکہ یہ وہی ابدی حقیقت ہے جو ہمیشہ سے انسانوں کے پاس موجود رہی ہے۔ چونکہ لوگوں نے اپنی غفلت سے اس کو مٹا دیا تھا یا اسے بدل ڈالا تھا اس لئے خدا نے اپنے آخری رسولؐ کے ذریعہ اس کو دوبارہ اپنی صحیح اور مکمل صورت میں ہمارے پاس بھیجا ہے۔

انسان کو اپنی زندگی کی تنظیم کے سلسلے میں بہت سی چیزیں درکار ہوتی ہیں۔ اس کے لئے ایک قانون کی ضرورت ہے، اس کے لئے ایک معاشی اور سیاسی ڈھانچے کی ضرورت ہے، اس کو شادی بیاہ کے ایک متعین طریقے کی ضرورت ہے۔ لباس، کھانا، پینا، اٹھنا، بیٹھنا، ہر چیز میں اس کے لئے کچھ آداب و قواعد کی ضرورت ہے۔ حتیٰ کہ یہ بھی اس کی ایک ضرورت ہے کہ اس کا ایک سماجی تہوار ہو جس میں لوگ ایک دوسرے کی خوشیوں میں شریک ہوں اور اپنی جائز تمنائیں پوری کریں۔ اس طرح کی اور بہت سی چھوٹی بڑی چیزیں ہیں جو زندگی گزارنے کے لئے لازمی ہیں اور ان کے متعلق بہرحال انسان کو ایک متعین شکل بتانا ضروری ہے۔

بلاشبہ یہ سب کچھ اسلام کے اندر موجود ہے اور ان میں سے ہر ایک کے بارے میں گفتگو کی جا سکتی ہے کہ اسلام کی بتائی ہوئی شکل دوسری مروجہ شکلوں کے مقابلے میں کس طرح زیادہ جامع اور زیادہ مفید ہے۔ مگر یہاں مجھے ان تمام پہلوؤں پر بحث نہیں کرنی ہے۔ جیسا کہ پچھلی گفتگو سے واضح ہو چکا ہے۔ زندگی میں ان چیزوں کی ضرورت زیادہ تر عملی پہلو سے ہے نہ کہ حل مسئلہ کے پہلو سے۔ دوسرے لفظوں میں زندگی کے مختلف شعبوں کے بارے میں ایک تفصیلی ڈھانچے کا موجود ہونا بذاتِ خود زندگی کو بہتر نہیں بناتا۔ یہ سب چیزیں اگرچہ زندگی کیلئے

ضروری ہیں مگر ان کی حیثیت روح کے ساتھ جسم کی سی ہے۔ روح کے ظاہر ہونے کے لئے ایک جسم کا ہونا ضروری ہے۔ مگر کسی انسانی وجود میں اصل چیز اس کی روح ہوتی ہے نہ کہ جسم۔ اگر یہ روح نہ ہو تو جسم خواہ کتنی ہی مکمل حالت میں موجود ہو ہم اس سے انسان کا کام نہیں لے سکتے۔ اسی طرح بہتر زندگی کی تعمیر کے سلسلے میں جو چیز سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے وہ انسان کی اپنی اصلاح ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کو زندگی کی پوری اسکیم میں فیصلہ کن عنصر کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ موجود ہو تو دوسری تمام چیزیں ٹھیک ٹھیک کام کریں گی اور اگر یہ نہ ہو تو کوئی بھی خارجی نقشہ ہمارے مسائل کو حل نہیں کر سکتا۔

زندگی کے اس اہم ترین سوال کا جواب اسلام کے اندر انتہائی مکمل اور صحیح شکل میں موجود ہے۔ اسلام سب سے پہلے یہ بتاتا ہے کہ یہ کائنات کوئی الل ٹپ جگہ نہیں ہے بلکہ اس کا ایک خدا ہے جو اپنی زبردست طاقت کے ذریعہ پوری دنیا پر فرماں روائی کر رہا ہے۔ اس طرح وہ انسان کے اندر ایک ایسی طاقت کا عقیدہ پیدا کرتا ہے جس کی پکڑ سے انسان اپنے آپ کو نہیں بچا سکتا۔ اور نہ اس سے بھاگ کر کہیں جا سکتا۔ وہ زندگی کے بارے میں یہ تصور دیتا ہے کہ وہ دو مرحلوں میں بٹی ہوئی ہے۔ اور موجودہ مرحلہ اگلے مرحلے کی تیاری کے لئے ہے۔ ہم آج جو کچھ کریں گے اس کا اچھا یا برا بدلہ اگلی زندگی میں پائیں گے۔ اس طرح آدمی کے اندر آئندہ زندگی میں کامیاب بننے کی طلب پیدا ہوتی ہے اور دنیا کی حرص جو تمام خرابیوں کی جڑ ہے اس کا جذبہ کمزور پڑ جاتا ہے۔ جب ٹرین سامنے کھڑی ہو تو کوئی شخص پلیٹ فارم کی بنچ پر جگہ حاصل کرنے کے لئے جھگڑا نہیں کر سکتا۔ اسی طرح جو شخص دنیا کی بے ثباتی اور اگلی زندگی کی اہمیت کو سمجھ جائے اس کے لئے ناممکن ہے کہ دنیوی منافع کے لئے لوگوں سے چھین جھپٹ کرے۔

آج چمبل کی وادی (ضلع آگرہ) میں ۲۵ ہزار پولس گھیرا ڈالے پڑی ہے مگر ڈاکوؤں کا گروہ اس کے قابو میں نہیں آتا۔ اسلام فرشتوں کی ایک ایسی پولس کا تصور دیتا ہے جو ہر انسان کے دونوں کندھوں پر بیٹھی ہوئی ہے اور اس کے تمام اعمال کا ریکارڈ تیار کر رہی ہے۔ جو مرنے کے بعد خدا کی عدالت میں پیش کیا جائے گا۔ یہ خیال آدمی کو اپنے تمام کھلے اور چھپے معاملات میں چوکنا کر دیتا ہے۔ وہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ وہ مستقل طور پر ایسی پولس کے پہرے میں ہے جس سے پیچھا چھڑانے کی کوئی سبیل نہیں۔

دوسری دنیا کے بارے میں اسلام یہ تصور دیتا ہے کہ وہاں جنت اور جہنم ہے ۔ جنت انتہائی عیش کی جگہ ہے اور جہنم بدترین عذاب کا مقام ۔ وہ تمام لذیذ اور بہترین چیزیں جن کی انسان تمنا کرسکتا ہے اسلام ایک ایک کا نام لے کر بتاتا ہے کہ وہ نہایت اعلیٰ شکل میں جنت میں موجود ہوں گی ۔ اور سخت ترین عذاب کی تمام صورتیں جن سے انسان آشنا ہے ' ان کے متعلق بتاتا ہے کہ وہ جہنم میں جانے والے شخص کو بھگتنا پڑیں گی ۔ ہر وہ انسان جو پیدا ہوا ہے اس کو ہمیشہ ہمیش کے لئے ان میں سے کسی ایک میں رہنا ہے ۔ یہ چیز آدمی کو بے قرار کردیتی ہے اور وہ اپنے ایک ایک لمحے کو فضولیات سے بچا کر صحیح ترین کام میں لگانا شروع کردیتا ہے ۔ پھر اسلام یہ بتاتا ہے کہ جس خدا کی عدالت میں تمہارا معاملہ جانے والا ہے اس پر نہ کسی کا زور ہے اور نہ کوئی سفارش وہاں سنی جانے والی ہے ۔ کسی کی مجال نہیں کہ اس کے حضور اپنی زبان کھول سکے ۔ یہ چیز اس کو بتاتی ہے کہ جھوٹے سہاروں پر تکیہ کرنا چھوڑ دے ۔ اور صرف خدا سے اپنا تمام تعلق قائم کرے ۔ پھر یہ کہ یہ سب کچھ اس طرح پیش آئے گا کہ ہم اپنے موجودہ احساسات کے ساتھ اپنی زندگی کا شعور رکھتے ہوں گے ۔ اپنی پچھلی زندگی ہر شخص کو اچھی طرح یاد ہوگی بلکہ اس کے سامنے ہوگی ۔ موت اس کے لئے محض نیند کی طرح کا ایک درمیانی وقفہ ہوگا اور وہ دوسری زندگی کو اسی طرح اپنی زندگی سمجھے گا جس طرح سوکر اٹھنے والا کوئی شخص سمجھتا ہے ۔ ہر آدمی دوسرے کو اسی طرح پہچانے گا جس طرح وہ آج پہچانتا ہے ۔ غرض آج ہمارا جو وجود ہے ' اسی وجود کے ساتھ ہم اپنی جزا یا سزا پائیں گے ۔

اس طرح اسلام کا آخرت کا تصور ایک ایسا تصور ہے جو آدمی کو ہلا دینے کے لئے کافی ہے ۔ اس نظرئے میں اس بات کی مکمل صلاحیت ہے کہ وہ سماج کی ضرورت کے مطابق نہایت فرض شناس اور دیانت دار شہری پیدا کرے اگر اس نظرئے کو کسی آبادی میں وسیع پیمانے پر پھیلایا جائے اور لوگوں کے ذہنوں میں اس کو اچھی طرح بٹھا دیا جائے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگ حساس اور ذمے دار بن جائینگے ۔ جب ایک شخص کو منتخب کرکے کسی کام پر لگا دیا جائے گا تو وہ اس احساس کے تحت اپنی ڈیوٹی کو ٹھیک ٹھیک انجام دے گا کہ اس کا جواب اسے مالک کائنات کو دینا ہے جو اس

کی تمام سرگرمیوں سے باخبر ہے، جس کی نگاہ سے اس کا کوئی چھوٹا یا بڑا کارنامہ چھپ نہیں سکتا۔

مدینے کے ایک باشندے ابومسعود انصاری کا واقعہ ہے، وہ اپنے غلام کو مار رہے تھے، اتنے میں انہوں نے پیچھے سے ایک آواز سنی ـــــ اعلم ابامسعود للہ اقدر علیک منک علیہ (ابومسعود! یاد رکھو اس غلام کے اوپر تم کو جتنا اختیار ہے، تمہارا خدا اس سے زیادہ تمہارے اوپر اختیار رکھتا ہے) دیکھا تو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے تھے۔ یہ فقرہ سنتے ہی ان کا حال بدل گیا۔ انہوں نے فوراً اپنا ہاتھ روک لیا اور بولے کہ اے خدا کے رسول! میں اس غلام کو خدا کی راہ میں آزاد کرتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ اگر تم ایسا نہ کرتے تو جہنم کی آگ تمہیں پکڑ لیتی۔ (مسلم) اس طرح اسلام ایک ایسا نظریہ عطا کرتا ہے جس کے ذریعہ آپ کسی بھی شخص کو کسی بھی مقام پر ٹوک سکتے ہیں اور وہ خود اپنے فائدے کی خاطر مجبور ہوگا کہ اس کی تنبیہ پر غور کرے۔ جبکہ موجودہ نظام میں کسی کو بدعنوانی سے روکنے کے لئے صرف پولس کے دفتر میں اس کی رپورٹ درج کرائی جا سکتی ہے، ایک ایسا دفتر جو رشوت لے کر اپنا ریکارڈ جلا سکتا ہے۔ اور اگر عدالت میں بھی جانا ہوا تو ملزم کو خوب معلوم ہے کہ ایک قابل وکیل کو فیس ادا کرنے کی صلاحیت ہونا کسی بھی مقدمے کو جیتنے کی کافی ضمانت ہے۔

غلط فہمی کا ازالہ

اوپر کی سطروں میں میں نے اسلام کے تصورِ زندگی کو اس حیثیت سے پیش کیا ہے کہ آج ہم جن مسائل میں گھرے ہوئے ہیں، ان کو وہ کس طرح حل کرتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہی اس کی کل حیثیت ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کوئی فرضی نظریہ نہیں ہے جو مسائل پیش آنے کے بعد ضرورت کے طور پر گھڑ لیا گیا ہو۔ حلِ مسائل کی غرض سے ہم دنیا کو کوئی فلسفیانہ فریب نہیں دے رہے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ سوال کہ "زندگی کے مسائل کا حل کیا ہے" یہ بذاتِ خود کوئی الگ سوال نہیں۔ بلکہ وہ اس بڑے سوال کا جزء ہے کہ "زندگی کی اصل حقیقت کیا ہے"۔ حقیقت سے مطابق ہونے ہی کا دوسرا نام مسائل کا حل ہونا ہے۔ جس نظامِ فکر کو اپنانے سے زندگی کے مسائل حل ہو جائیں" یہ اس بات کا ثبوت ہوگا کہ یہی نظامِ فکر کائنات کی اصل حقیقت ہے اور کسی نظامِ فکر کا

اصل حقیقت ہونا خود بخود یہ معنی رکھتا ہے کہ اس سے انسانیت کے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔

خاتمہ

اس وقت میں نے جو کچھ عرض کیا ہے اس کا مقصد ذہنی طور پر آپ کو اس مقام تک پہنچانا ہے جہاں سے آپ اپنی منزل کو دیکھ سکیں۔ اور ان سوالات کا جواب پالیں جو آپ کو اور ساری انسانیت کو گھیرے ہوئے ہیں۔ میں نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ اب یہ آپ پر ہے کہ آپ اپنے لئے کیا فیصلہ کرتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ آپ کو میری بات لازماً صحیح نظر آنی چاہئے۔ میں آپ کو اختلاف کا حق دیتا ہوں۔ مگر یاد رکھئے کہ جب کسی معاملے میں آدمی کو اپنی رائے مختلف نظر آتی ہے تو ضروری نہیں ہے کہ وہ اس کی حقیقی رائے ہو۔ اکثر رائیں محض آدمی کے موروثی جذبات کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ آدمی کہتا ہے کہ "میرا خیال یہ ہے" حالانکہ وہ در اصل ماحول کا خیال ہوتا ہے جس کو وہ اپنا سمجھ کر دہرا دیتا ہے۔ عقیدے، رائیں اور تعلقات بیشتر حالات میں تاریخ اور ماحول کے اثر سے بنتے ہیں۔ ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں جنہوں نے فی الواقع اپنے خاندان اور اپنے گرد و پیش سے اوپر اٹھ کر خالص عقلی غور و فکر کے نتیجے میں کوئی عقیدہ اپنایا ہو، کوئی رائے قائم کی ہو یا کسی سے اپنے تعلقات جوڑے ہوں۔ اس لئے آج آپ جس عقیدے کو اپنا عقیدہ اور جس طریق زندگی کو اپنا طریق زندگی کہتے ہیں، ضروری نہیں ہے کہ واقعہ بھی ایسا ہی ہو۔ بہت ممکن ہے کہ ایک مخصوص خاندان میں پیدا ہونے کی وجہ سے یہ چیزیں آپ کے ساتھ چمٹ گئی ہوں۔ میں آپ کو یہی معلوم کرنے کی دعوت دیتا ہوں۔ آپ سوچئے کہ آپ نے جس عقیدے کو اپنا رکھا ہے وہ فی الواقع آپ کی سوچی سمجھی راہ ہے یا محض باپ دادا کی پیروی میں آپ بے سوچے سمجھے اس پر چلے جا رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر آپ ان دونوں کے فرق کو سامنے رکھیں گے اور وراثتی جذبات اور ماحول کے تاثرات سے الگ ہو کر اپنی راہ ڈھونڈھنے کی کوشش کریں گے تو لازماً میری تائید کریں گے اور اس وقت آپ کو صاف نظر آئے گا کہ حقیقۃً انسان کی منزل کس طرف ہے۔

نوٹ: یہ مقالہ آریہ سماج (الہ آباد) کے ایک جلسہ میں پیش کیا گیا جو سرو دھرم سمیلن کے عنوان سے ۲۲ مئی ۱۹۶۰ کو ہوا تھا۔

دور جدید میں انسان کے مسائل

اسلام کی تعلیمات کے بنیادی طور پر دو حصے ہیں۔ ایک خدا سے متعلق، اور دوسرا بندوں سے متعلق۔ پہلی قسم کی تعلیمات کو عبادات کہا جاسکتا ہے اور دوسری قسم کی تعلیمات کو معاملات۔

عبادات سے متعلق اسلام کی جو تعلیمات ہیں وہ ناقابل تغیر ہیں۔ ان میں کسی قسم کی کمی بیشی جائز نہیں جس چیز کو اسلام میں بدعت کہا گیا ہے (كلّ بدعة ضلالة وكلّ ضلالة فى النار) اس کا تعلق حقیقۃً انھیں اول الذکر حصۂ احکام سے ہے۔

مگر ثانی الذکر احکام (معاملات) کی نوعیت اس سے مختلف ہے۔ اس شعبہ میں ہم کو صرف بنیادی احکام دئے گئے ہیں۔ اس کے بعد ہم کو آزاد چھوڑ دیا گیا ہے کہ ہر دور کے حالات کے مطابق ہم ان احکام کو منطبق کرتے رہیں۔ اجتہاد کا تعلق اسی دوسرے حصہ احکام سے ہے۔ اجتہاد حقیقۃً بدلے ہوئے دنیوی حالات میں اسلام کی بنیادی تعلیمات کا انطباق تلاش کرنے کا دوسرا نام ہے۔

دونوں قسم کی تعلیمات کا یہ فرق حدیث سے واضح ہے۔ چنانچہ عبادات سے متعلق احکام کے بارہ میں نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَنْ احدث فى امرنا هذا ما ليس منا فهو رد (جو شخص ہمارے اس دین میں ایسی نئی بات نکالے جو اس میں نہ ہو وہ قابل رد ہے۔)

دوسرے حصۂ احکام کی مختلف نوعیت تأبیر نخل کے واقعہ سے واضح ہے۔ پیغمبر اسلام ایک بار مدینہ کے باہر کھجوروں کے ایک باغ سے گذرے۔ وہاں کچھ لوگ درخت کے اوپر چڑھے ہوئے کچھ کر رہے تھے۔ انھوں نے پوچھا کہ تم کیا کر رہے ہو۔ لوگوں نے بتایا کہ ہم نر کو مادہ پر مار رہے ہیں۔ آپ نے اس کو پسند نہیں فرمایا۔ چنانچہ وہ لوگ رک گئے۔ مگر یہ زرخیزی کا معاملہ تھا اور زرخیزی کے بغیر درختوں میں پھل نہیں آتے۔ چنانچہ اس سال کھجور کی پیداوار بہت کم ہوئی۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو جب معلوم ہوا تو آپ نے فرمایا کہ ویسا ہی کرو جیسا تم پہلے کرتے تھے۔ کیوں کہ تم اپنے دنیوی معاملات کو زیادہ بہتر جانتے ہو۔ (انتم اعلم بامور دنياكم)

ان دونوں روایات سے واضح طور پر ثابت ہے کہ عبادات کے معاملہ میں کوئی اجتہاد نہیں ہے مگر جہاں تک معاملات کا تعلق ہے ان میں اجتہاد اور انطباق کا دروازہ ہمیشہ کے لئے کھلا ہوا ہے۔

مجھے اس مقالہ میں اسلامی احکام کے صرف دوسرے حصہ کے بارے میں گفتگو کرنی ہے۔ تاہم اس دوسرے حصہ کے بھی دو الگ الگ پہلو ہیں۔ اس اعتبار سے زیر بحث موضوع کو دو حصوں میں تقسیم

کیا جا سکتا ہے۔ پہلا حصہ وہ ہے جس کا تعلق انسانی معاملات میں اسلام کے بنیادی نقطہ نظر سے ہے۔ دوسرے حصہ کا تعلق اس بنیادی قانونی ڈھانچہ سے ہے جو اسلامی شریعت انسان کے مسائل کے حل کے لئے پیش کرتی ہے۔ یہاں میں اپنی گفتگو کو موضوع کے پہلے حصہ تک محدود رکھوں گا۔

قرآن میں ہے کہ حق اگر ان کی خواہشوں کی پیروی کرتا تو آسمان وزمین اور جو کچھ ان میں ہے سب میں فساد ہو جاتا (المومنون ۷۱)

تخلیق کے بارہ میں خدا کا منصوبہ ایک کامل منصوبہ ہے۔ انسان کے سوا بقیہ کائنات ٹھیک ٹھیک اسی خدائی منصوبہ پر چل رہی ہے۔ اس لئے بقیہ کائنات نہایت درست ہے، اس میں کہیں کوئی خرابی نہیں (الملک ۳) مگر انسان اپنے عمل کے لئے آزاد ہے۔ وہ حق کو چھوڑ کر اپنی خواہش پر چلتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسانی دنیا میں فساد برپا رہتا ہے۔ انسان کا بگاڑ دراصل انسان کی آزادی کی قیمت ہے۔

انسان کے مسائل کا حل اسلام کے نزدیک وہی ہے جو بقیہ کائنات کے مسائل کا حل ہے۔ انسان اپنی خواہش پر چلنے کے بجائے اسی حق پر چلے جس پر کائنات کی بقیہ تمام چیزیں چل رہی ہیں۔ ایسا کرتے ہی انسانی سماج میں وہی اصلاح اور ہم آہنگی پیدا ہو جائے گی جو بقیہ کائنات میں بروقت موجود ہے۔

حق پر چلنا کیا ہے اور خواہش پر چلنا کیا۔ اس کی ایک مثال لیجئے جو قرآن میں ہے: سورج کے لئے ممکن نہیں کہ وہ چاند سے ٹکرا جائے اور نہ رات ایسا کر سکتی ہے کہ وہ دن سے آگے بڑھ جائے۔ ہر ایک اپنے مدار میں گردش کرتا ہے (یٰسین ۴۰)

خدا کے منصوبہ کے مطابق خدا کا قانون ہے کہ ہر ایک اپنے اپنے مدار میں چلے۔ اسی کے مطابق تمام فلکیاتی اجرام حرکت کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے درمیان آپس میں ٹکراؤ نہیں ہوتا۔ اس حق کا اطلاق انسان پر اس طرح ہوگا کہ آدمی اپنے اپنے دائرہ میں عمل کرے۔ اگر ہر آدمی ایسا کرے تو پورے سماج کا نظام درست رہے گا۔ اس کے برعکس اگر ہر آدمی اپنی خواہش پر چلنے لگے تو لوگوں میں ٹکراؤ ہوگا اور سوسائٹی میں اور بین اقوامی زندگی میں فساد برپا ہو جائے گا۔

کہا جاتا ہے کہ امریکہ جب بیرونی سیاسی غلبہ سے آزاد ہوا تو ایک امریکی اپنے گھر سے باہر نکلا وہ سڑک پر آزادانہ طور پر چل رہا تھا۔ دوسرے راہ گیروں کا لحاظ کئے بغیر وہ اپنا ہاتھ زور زور سے ہلا رہا تھا۔ اسی اثنا میں اس کا ہاتھ ایک راہ گیر کی ناک سے ٹکرا گیا۔

راہ گیر نے بگڑ کر کہا کہ یہ کیا بدتمیزی ہے۔ تم اس طرح اپنا ہاتھ بے ڈھنگے طور پر ہلاتے ہوئے کیوں چل رہے ہو، امریکی نے جواب دیا کہ اب ہمارے ملک نے آزادی حاصل کر لی ہے۔ آج میں

آزاد ہوں کہ جو چاہوں کروں اور جس طرح چاہوں چلوں۔ راہ گیر نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ کہا:
جناب، آپ کی آزادی وہاں ختم ہوجاتی ہے جہاں سے میری ناک شروع ہوتی ہے۔

Your freedom ends where my nose begins

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: تم ناپ اور تول کو پورا کرو اور لوگوں کو ان کی چیزیں گھٹا کر نہ دو اور زمین میں اصلاح کے بعد فساد نہ کرو (الاعراف ۸۵)

اس آیت کے مطابق خدا کی بنائی ہوئی زمین ایک اصلاح یافتہ زمین ہے۔ یہاں ہر چیز درست طریقہ پر قائم ہے۔ ہر چیز عین وہی کر رہی ہے جو اسے کرنا چاہئے۔ زمین کا یہ نظام انسان کے لئے اپنے معاملات کا معیار اور پیمانہ ہے۔ انسان کو چاہئے کہ اپنے عمل کو اسی قدرتی پیمانہ سے ناپے اور اس سے مطابق کرکے اپنے ہر عمل کو درست کرتا رہے۔ اگر انسان ایسا کرے گا تو اس کی سوسائٹی امن اور انصاف کی سوسائٹی ہوگی۔ اس کے برعکس اگر وہ زمین میں رکھے ہوئے اس پیمانہ سے مطابقت نہیں کرے گا تو انسان کا سماج بگڑ جائے گا۔ وہ اصلاح کی دنیا میں فساد کی دنیا بنانے کے ہم معنی ہوگا۔

فطرت سے یہ مطابقت ہی ہماری تمام کامیابیوں کا راز ہے۔ موجودہ زمانہ کی ٹکنکل ترقیوں کو دیکھ کر آدمی حیران رہ جاتا ہے۔ مگر یہ ٹکنکل ترقیاں کیا ہیں۔ وہ فطرت سے مطابقت کا دوسرا نام ہیں۔ یہی طریقہ ہم کو انسانی سماج کی اصلاح کے لئے بھی اختیار کرنا ہے۔ مادی ترقیاں فطرت سے مطابقت کے نتیجے میں حاصل ہوتی ہیں۔ اسی طرح انسانی سوسائٹی بھی نیچر سے مطابقت ہی کے ذریعہ درست ہوگی۔ خدا کی اس دنیا میں اصلاح و ترقی کا ایک ہی یقینی طریقہ ہے، اور وہ فطرت سے مطابقت ہے۔ مادی دنیا کے لئے بھی اور انسانی دنیا کے لئے بھی۔

ستاروں اور سیاروں کی گردش میں جو نظم ہے وہی نظم کائنات کی تمام چیزوں میں کمال درجہ میں پایا جاتا ہے۔ اس دنیا کے تمام واقعات اتنے منظم طور پر ظہور میں آتے ہیں کہ ان کو پیشگی طور پر معلوم کیا جاسکتا ہے۔ کائنات کی ناقابل بیان حد تک حیرت انگیز تنظیم اتنی کامل ہے کہ وہ اپنی فطرت میں قابل پیشینگوئی بن گئی ہے۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ کائنات انتہائی حد تک مکمل ہے۔ اس میں ابدیت، معنویت اور حسن کمال طور پر پایا جاتا ہے۔ وہ نقص یا کمی سے اتنا زیادہ خالی ہے کہ اس پر اربوں سال گذر گئے اور اس میں کسی نظر ثانی کی ضرورت پیدا نہیں ہوئی۔

موجودہ زمانے میں سائنس نے اس قانون فطرت کو بہت بڑے پیمانے پر انسانی مقاصد کے لئے استعمال کیا ہے۔ مادی دنیا میں قوانین فطرت کا انطباق کیا گیا تو اس کے حیرت انگیز نتائج

برآمد ہوئے۔ دھات بجلی کی روشنی میں تبدیل ہوگئی۔ جامد مادہ حرکت بن کر دوڑنے لگا، مادہ شاندار تمدن میں ڈھل گیا وغیرہ ——— مگر اسی اصول کو انسان خود اپنی زندگی میں اختیار کرنے کے لئے تیار نہیں۔ یہی تضاد انسان کے تمام مسائل کی جڑ ہے۔ انسان جس سائنس (علم فطرت) کو میکینکل دنیا میں کامیابی کے ساتھ استعمال کر رہا ہے اسی سائنس کو وہ انسانی دنیا میں استعمال کرنے کے لئے تیار نہیں۔

ضرورت ہے کہ یہی آفاقی اصول انسانی زندگی میں بھی رائج ہوں۔ انسان بھی سوسائٹی کے اندر اسی طرح عمل کرے کہ ہر ایک اپنے دائرہ میں رہے، کوئی شخص دوسرے کے دائرہ میں داخل نہ ہو۔ انسان اپنی فطرت میں چھپے ہوئے تعمیری امکانات کو واقعہ بنائے۔ وہ اپنی زندگی کو اس طرح منظم کرے کہ وہ قابل پیشینگوئی کردار کا مالک بن جائے جس طرح بقیہ کائنات قابل پیشین گوئی کردار کی مالک بنی ہوئی ہے۔

یہی انسان کا سب سے بڑا مقصود ہے اور یہی اصلاً تمام مذاہب کا خلاصہ ہے۔ پھر یہی اسلام کا خلاصہ بھی ہے جو آسمانی مذہب کا صحیح اور مستند اڈیشن ہے۔ اسلام حقیقۃً اس بات کی دعوت ہے کہ انسان اپنی زندگی کی تعمیر کے لئے کائناتی نظام کو اپنا ماڈل بنائے۔ وہ اسی طرح زندگی گزارے جس طرح بقیہ وسیع کائنات کے تمام اجزاء اپنا اپنا وظیفہ پورا کر رہے ہیں۔

طبیعیاتی مشاہدہ بتاتا ہے کہ کائنات کی ہر چیز کا ایک قانون ہے اور وہ انتہائی لزوم کے ساتھ اس پر قائم ہے۔ پروفیسر آرن رکسبرگ (لندن) کے الفاظ میں:

"کائنات تعجب خیز حد تک یکساں ہے۔ ہم خواہ کسی طور پر بھی اس کو دیکھیں، کائنات کے اجزاء میں وہی ترکیب اسی تناسب سے پائی جاتی ہے۔ زمین پر جو طبیعیاتی قوانین دریافت کئے گئے ہیں وہ حکمی اعداد پر مشتمل ہیں، جیسے کسی الکٹران کی مقدار مادہ کا تناسب ایک پروٹان کے مقدار مادہ سے جو کہ تقریباً ۱۸۴۰ کے مقابلہ میں ایک ہوتا ہے۔ یہ تناسب ہر جگہ اور ہر وقت پایا جاتا ہے۔ ایسا کیوں ہے۔ کیا ایک خالق نے تحکمی طور پر انھیں اعداد کا انتخاب کر رکھا ہے۔ کیا کائنات کے وجود کے لئے ان اعداد میں وہی تناسب قدر ضروری ہے جو ہم دیکھتے ہیں (سنڈے ٹائمس، لندن، ۴ دسمبر ۱۹۷۷)

یہ سائنس کی زبان میں وہی بات ہے جو قرآن کی زبان میں ان لفظوں میں کہی گئی ہے: خدا نے ہر چیز کو پیدا کیا۔ پھر ہر چیز کا الگ الگ اندازہ مقرر کیا (الفرقان ۲) قرآن میں دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے: کیا وہ خدا کے دین کے سوا اور کوئی دین چاہتے ہیں حالانکہ زمین و آسمان کی تمام چیزیں اسی کی مطیع ہیں، خوشی سے یا ناخوشی سے۔ اور سب کو آخر کار خدا ہی کی طرف لوٹنا ہے۔

جس چیز کو سائنس میں قانون قدرت کہا جاتا ہے اسی کا مذہبی نام دین ہے۔ اللہ کا جو دین عملاً زمین و آسمان کی تمام چیزوں پر قائم ہے۔ وہی دین انسان سے بھی مطلوب ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ بقیہ کائنات اس دین خدا پر جبر کے ذریعہ قائم ہے اور انسان کو یہ دین خود اپنے اختیار سے اپنے اوپر قائم کرنا ہے۔

قرآن میں دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے:

اور خدا نے سورج اور چاند کو مسخر کر دیا۔ ہر ایک معین وقت پر چلتا ہے۔ اللہ معاملہ کی تدبیر کر رہا ہے اور وہ نشانیوں کو بیان کرتا ہے تاکہ تم اپنے رب سے ملاقات کا یقین کرو (الرعد ۲)

اس آیت میں تدبیر امر سے مراد کائنات کا خدائی نظام ہے۔ اور تفصیل آیات سے مراد وہ وحی ہے جو پیغمبروں پر اتری۔ خدا اپنے قانون کو بقیہ دنیا میں براہ راست اپنے نظام کے تحت عملاً قائم کئے ہوئے ہے۔ اسی قانون کو وہ پیغمبروں کے ذریعہ انسان کے پاس بھیجتا ہے تاکہ انسان اپنی آزاد مرضی سے اسی قانون الٰہی پر عمل کرے۔ گویا آسمانی کتاب (قرآن) جس حقیقت ربانی کا لفظی بیان ہے، کائنات اسی کا عملی مظاہرہ ہے۔

یہی بات ہے جو حضرت مسیح کی زبان سے انجیل میں ان الفاظ میں نقل کی گئی ہے: پس تم اس طرح دعا کیا کرو کہ اے ہمارے باپ، تو جو آسمان پر ہے، تیرا نام پاک مانا جائے۔ تیری بادشاہی آئے۔ تیری مرضی جیسی آسمان پر پوری ہوتی ہے زمین پر بھی پوری ہو (متی ۶: ۱۰)

اینتون چیخوف (۱۹۰۴ - ۱۸۶۰) نے بجا طور پر کہا ہے کہ یہ دنیا بے حد حسین ہے۔ اس میں صرف ایک ہی چیز ہے جو حسین نہیں، اور وہ انسان ہے۔ ایک ایسی دنیا جہاں کوئی چیز کسی دوسری چیز کی دشمن نہیں، ایک انسان دوسرے انسان کا دشمن بنتا ہے۔ ایک ایسی دنیا جہاں بارش برستی ہے تاکہ زمین پر فصل اگے، وہاں آدمی آگ برساتا ہے تاکہ فصلیں تباہ ہوں۔ ایک ایسی دنیا جہاں ہر طرف اصلاح کا منظر دکھائی دیتا ہے، وہاں انسان فساد اور بگاڑ پیدا کرتا ہے۔

دو دنیاؤں میں اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ بقیہ دنیا پوری طرح خالق کے نقشہ کے مطابق چل رہی ہے، وہ ویسے ہی رہنے کے لئے مجبور ہے جیسا کہ خدا چاہتا ہے کہ وہ رہے۔ مگر انسان کو اللہ کی طرف سے آزادی ملی ہوئی ہے۔ وہ اپنے ارادے کے تحت ایک یا دوسرے راستے پر چلنے کا اختیار رکھتا ہے۔ انسانی دنیا میں بگاڑ کی وجہ تمام تر یہی ہے۔ بقیہ دنیا خدا کے نقشہ کی پابند ہے۔ اس لئے وہ مکمل طور پر درست ہے۔ اس کے برعکس انسان خدا کے نقشہ سے انحراف کرتا ہے۔ اس لئے اس کے سارے معاملات میں بگاڑ پایا جا رہا ہے۔ ہر برائی جو زمین پر پائی جاتی ہے وہ دراصل انسانی آزادی کا غلط استعمال ہے۔

سائنس کیا ہے؟ سائنس قانون فطرت کا استعمال ہے۔ سائنس مادہ کو تمدن میں تبدیل کرتی ہے۔ اسی طرح مذہب انسانی زندگی کو معیاری سماج میں تبدیل کرنے کا علم ہے۔ اس اعتبار سے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ مذہب (اسلام) زندگی کی سائنس ہے۔ بقیہ چیزوں میں یہ سائنس مادہ کے جبری قانون کے تحت عمل کرتی ہے۔ اور انسان خود اپنے ارادہ سے اپنے آپ کو اس قانون فطرت کا پابند بناتا ہے۔

سائنس کے موضوعات میں سے ایک اہم موضوع وہ ہے جس کو قدرت کی نقل کہتے ہیں۔ اس کا مقصد قدرت کے نظاموں کو سمجھ کر ان کی میکینکل نقل کرنا ہے۔ اس سائنسی شاخ کا نام (Bionics) ہے۔ مثلاً کشتی مچھلی کی نقل ہے۔ ہوائی جہاز چڑیا کی نقل ہے۔ کیمرہ آنکھ کی میکینکل نقل ہے۔ کمپوٹر انسانی دماغ کی میکینکل نقل ہے وغیرہ وغیرہ۔ قدرت کے ماڈل کو ہم اپنی میکینکل دنیا میں نہایت کامیابی کے ساتھ استعمال کر رہے ہیں۔ اسلام کا پیغام یہ ہے کہ قدرت کے اسی ماڈل کو انسانی زندگی کے نظام میں بھی منطبق کیا جائے۔ کائنات کا جو علم ہمیں جدید شہروں کی تعمیر کا فن بتاتا ہے وہی علم ہمیں سماجی تعمیر کے اصول بھی دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانی زندگی کی تنظیم کے لئے تمام ضروری ماڈل کائنات میں موجود ہیں۔ البتہ چوں کہ انسان کو عمل کی آزادی دی گئی ہے اور وہ اس امتحان کی حالت میں ہے کہ وہ اپنی آزادی کو صحیح استعمال کرتا ہے یا غلط۔ اس لئے یہ تمام ماڈل تمثیلی انداز میں قائم کئے گئے ہیں۔

یہاں انسان کو یہ کرنا ہے کہ وہ تمثیل کو واقعہ کے روپ میں دیکھے۔ انسان کو یہ ثبوت دینا ہے کہ وہ کائنات میں خالق کے خاموش کلام کو سن سکتا ہے۔ وہ قدرت کے اشاروں کو الفاظ کا روپ دے سکتا ہے۔ وہ تمثیلی ماڈل کو سمجھ کر اپنی حقیقی زندگی میں عملاً استعمال کر سکتا ہے۔ انسان کو اپنے آزادانہ ارادہ کے تحت وہی کچھ کرنا ہے جو بقیہ چیزیں مجبورانہ نظام کے تحت کر رہی ہیں۔

۱۔ اس سلسلہ میں کائناتی ماڈل کی ایک مثال وہ ہے جس کو ہم نے اوپر نقل کیا ہے۔ یعنی کائنات میں بے شمار اجرام (Bodies) ہیں۔ اور سب حرکت کر رہے ہیں۔ مگر سب اپنے اپنے مدار کا پابند ہو کر حرکت کرتے ہیں۔ کوئی اپنے مقرر دائرہ سے باہر نہیں جاتا۔ اسی لئے ان کے درمیان کبھی ٹکراؤ نہیں ہوتا۔ حتی کہ فلکیات داں کہتے ہیں کہ بعض اوقات ایک پورا کہکشانی نظام اپنے اربوں ستاروں کے ساتھ حرکت کرتے ہوئے دوسرے کہکشانی نظام میں داخل ہوتا ہے اور اس سے گذر کر باہر نکل جاتا ہے بغیر اس کے کہ دونوں کے درمیان کوئی ٹکراؤ ہو۔

یہ ایک ماڈل ہے جو بتاتا ہے کہ انسان کو اپنی زندگی کا سفر اس طرح جاری کرنا چاہیے کہ ایک اور دوسرے کے درمیان مفادات کا ٹکراؤ نہ ہو۔ حتی کہ ایک قوم (انسانوں کا مجموعہ) دوسری قوم

سے ملے اور گذر جائے۔ مگر دونوں کے درمیان ٹکراؤ کی نوبت نہ آئے۔

یہی بات قرآن میں ان لفظوں میں کہی گئی ہے ـــــ ولا تطیعوا امر المسرفین الذین یفسدون فی الارض ولا یصلحون (الشعراء ۱۵۲)

۲ - اسی طرح ایک ماڈل وہ ہے جو شہد کی مکھیوں کے چھتہ کی شکل میں قائم ہے۔ شہد کی مکھیوں کے چھتہ میں نہایت کامیاب قسم کی ایک منظم اسٹیٹ ہوتی ہے۔ اس اسٹیٹ کا نظام ایک ملکہ مکھی کے تحت عمل کرتا ہے۔ تمام مکھیاں حد درجہ محنت اور نظم کے ساتھ اپنی اپنی ڈیوٹی پر لگی رہتی ہیں۔ شہد کی مکھی کے چھتہ کے اندر نہایت معیاری قسم کی (Result-oriented) سرگرمیاں رات دن جاری رہتی ہیں۔

یہ ایک نمونہ ہے جو بتاتا ہے کہ انسانی سماج کی تنظیم کو کن اصولوں پر کام کرنا چاہیے۔ وہ یہ کہ تمام انسان ایک واحد نظام کے تابع ہوں۔ ایک خدا کی فرماں برداری میں ہر آدمی اور بحیثیت مجموعی پورا سماج اپنی اپنی ڈیوٹی کو پوری طرح انجام دے۔ واعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا (آل عمران ۱۰۳)

۳- اسی طرح ایک ماڈل وہ ہے جو درخت کی صورت میں قائم ہے۔ انسان سانس لیتا ہے وہ ہر سانس میں ہوا سے آکسیجن لیتا ہے اور کاربن خارج کرتا ہے۔ اسی طرح درخت بھی سانس لیتے ہیں مگر ان کا معاملہ بالکل برعکس ہے۔ وہ فضا سے کاربن لے کر آکسیجن خارج کرتے رہتے ہیں۔ اگر درخت بھی وہی کریں جو انسان کرتا ہے تو ساری فضا کاربن سے بھر جائے اور انسان کے لئے زندہ رہنا مشکل ہو جائے۔

یہ ماڈل انسانی زندگی میں اس طرح مطلوب ہے کہ انسان کو دوسرے کی طرف سے شکایت پہنچے تو وہ اس کو برداشت کرے، وہ تلخ کلمہ سن کر میٹھے الفاظ میں اس کا جواب دے۔ وہ برے سلوک کا تجربہ کرنے کے بعد اچھے سلوک میں اس کا ردّ عمل ظاہر کرے۔ پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے رب نے مجھے حکم دیا ہے کہ جو مجھ سے کٹے میں اس سے جڑوں، جو مجھے محروم کرے میں اسے دوں، جو مجھ پر ظلم کرے میں اسے معاف کر دوں۔

اسی چیز کو پیغمبر اسلام نے دوسرے موقع پر ان لفظوں میں بیان فرمایا: تخلقوا باخلاق اللہ (خدا کی اخلاقیات کو اختیار کرو) خدا کی اخلاقیات وہی ہیں۔ جو اس نے اپنی مخلوقات کی دنیا میں عملاً قائم کر رکھا ہے۔ اسی خدائی اخلاقیات کو انسان کو بھی اختیار کرنا ہے۔ جو اخلاقیات بقیہ دنیا میں خدا کے اپنے زور پر قائم ہیں، اسی اخلاقیات کو انسانی دنیا میں خود انسان کے اپنے ارادہ

سے قائم کرنا ہے۔ یہی خدا کا اتارا ہوا مذہب ہے اور یہی اسلام ہے اور اسی میں انسانیت کے تمام مسائل کا حل چھپا ہوا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ حکمت اور معنویت کا جو واقعہ وسیع تر کائنات میں خدا اپنے براہ راست کنٹرول کے تحت ظہور میں لا رہا ہے، وہی واقعہ انسان کو اپنی ذاتی زندگی میں ذاتی کنٹرول کے تحت وجود میں لانا ہے۔ جو واقعہ خدا نے بقیہ دنیا میں مادی سطح پر قائم کر رکھا ہے۔ اسی کو انسانی دنیا میں انسان کی سطح پر قائم کرنا ہے۔

کائناتی سطح پر جو چیز لوہا کی شکل میں پائی جاتی ہے وہ انسانی سطح پر پختہ کرداری کی صورت میں مطلوب ہے۔ کائناتی سطح پر جو چیز پتھر۔ ملی زمین سے چشمہ کی صورت میں بہہ نکلتی ہے وہ انسان سے نرم مزاجی کی صورت میں مطلوب ہے۔ کائناتی سطح پر جو چیز قابل پیشین گوئی کردار کی صورت میں پائی جاتی ہے وہ انسانی سطح پر ایفائے عہد (وعدہ پورا کرنا) کی صورت میں مطلوب ہے۔ کائناتی سطح پر جو چیز مہک اور رنگ کی صورت میں پائی جاتی ہے وہ انسانی سطح پر اچھے سلوک اور خوش معاملگی کی صورت میں مطلوب ہے۔ درخت خراب ہوا (کاربن) کو لے لیتا ہے اور اس کے بدلے اچھی ہوا (آکسیجن) ہماری طرف لوٹا دیتا ہے۔ یہی بات انسانی سطح پر اس اصول کی صورت میں مطلوب ہے کہ "جو تمہارے ساتھ برا سلوک کرے اس کے ساتھ تم اچھا سلوک کرو"۔ کائنات میں کوئی چیز کسی دوسرے کی کاٹ میں لگی ہوئی نہیں ہے۔ ہر ایک پوری یکسوئی کے ساتھ اپنا اپنا حصہ ادا کرنے میں مصروف ہے۔ یہی چیز انسانی سطح پر اس طرح مطلوب ہے کہ وہ ہمیشہ مثبت جدوجہد کرے، منفی نوعیت کی کارروائیوں سے وہ مکمل طور پر پرہیز کرے۔ کائنات میں (Recycle) اور (Decompose) کا اصول کارفرما ہے۔ فضلات دوبارہ استعمال ہونے کے لئے گیس میں تبدیل کر دئے جاتے ہیں۔ پتی درخت سے گر کر ضائع نہیں ہوتی بلکہ کھاد بن جاتی ہے۔ یہی چیز انسانی زندگی میں اس طرح مطلوب ہے کہ انسان کی خرچ کی ہوئی دولت دوبارہ انسان کے لئے مفید بنے۔ ایک انسان کی چھیڑی ہوئی جدوجہد دوسرے انسانوں کو اچھے پھل کا تحفہ دے۔ کائنات میں عظیم الشان سطح پر بے شمار کام ہو رہے ہیں۔ ہر جز انتہائی صحت اور پابندی کے ساتھ اپنی ڈیوٹی کی انجام دہی میں لگا ہوا ہے۔ مگر کسی کو یہاں کوئی ظاہری بدلہ نہیں ملتا۔ یہی چیز انسان سے اس طرح مطلوب ہے کہ وہ مکمل طور پر اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے میں لگا رہے، بغیر اس کے کہ دنیا میں اس کو اس کے عمل کا کوئی معاوضہ ملنے والا ہو۔ اونچا پہاڑ اور تمام کھڑی ہوئی چیزیں اپنا سایہ زمین پر ڈال دیتی ہیں۔ یہی چیز

انسانی زندگی میں اس طرح مطلوب ہے کہ ہر آدمی تواضع اختیار کرے۔ کوئی کسی کے اوپر فخر نہ کرے۔ کوئی دوسرے کے مقابلہ میں اپنے کو بڑا نہ سمجھے۔

اب سوال یہ ہے کہ انسان سے یہ ربانی اخلاقیات کیوں مطلوب ہیں، اور کیوں ایسا ہوا ہے کہ اس کے لئے خدا نے اپنی کتاب (قرآن) بھیجی اور کائنات میں بہت بڑے پیمانے پر اس کے عملی مظاہرہ کا انتظام کیا تاکہ آدمی خدا کی کتاب میں جس چیز کو پڑھے اس کو عملی نمونہ کی صورت میں اپنے باہر دیکھ لے اور اس پر عمل کرنا اس کے لئے آسان ہو جائے۔ اس کو سمجھنے کے لئے خدا کی اسکیم کو سمجھنا پڑے گا جس کی خاطر یہ ساری دنیا بنائی گئی ہے۔

خدا نے انسان کے لئے ایک ابدی جنت بنائی جو ہر قسم کی محدودیتوں اور کمیوں سے خالی ہے۔ جہاں انسان کو یہ موقع ملے گا کہ وہ ہر قسم کے دکھ اور تکلیف سے آزاد ہو کر ہمیشہ ہمیش کے لئے زندگی گذارے۔ مذکورہ اخلاقیات دراصل اسی جنت کے باسیوں کی اخلاقیات ہیں، جو لوگ ان اعلیٰ اخلاقیات کا ثبوت دیں گے وہی اس قابل ٹھہریں گے کہ ان کو جنت کے اعلیٰ ماحول میں بسایا جائے۔

ہر انسان ایک بہتر دنیا کی تلاش میں ہے، ایک ایسی دنیا جہاں وہ اپنی کمیوں کی تلافی کر سکے جہاں وہ ہر قسم کی خوشیوں اور لذتوں کو ابدی طور پر حاصل کر سکے۔ یہ ہر انسان کا مطلوب ہے۔ مگر ہر انسان اپنے مطلوب کو غلط مقام پر تلاش کر رہا ہے۔ جو چیز موت کے بعد کی زندگی میں رکھی گئی ہے اس کو وہ موت سے پہلے کی زندگی میں حاصل کرنا چاہتا ہے۔

ایک کسان اگر اپنے لئے کوئی فصل اگانا چاہتا ہے تو وہ کائنات کے انتظام سے مطابقت کر کے ہی ایسا کر سکتا ہے۔ ایک انجینئر اگر ایک کارخانہ بنانا چاہتا ہے تو وہ اپنے منصوبہ میں اسی وقت کامیاب ہو سکتا ہے جب کہ وہ قوانین فطرت کو جان کر اسے استعمال کرے۔ ایسا ہی معاملہ انسانی زندگی کی تعمیر کا بھی ہے۔ انسان اگر اپنے لئے ایک پر مسرت اور کامیاب زندگی حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کو وہ خدائی اسکیم سے مطابقت کر کے ہی اپنے لئے پا سکتا ہے۔ خدا کی اسکیم یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں آدمی جنتی کردار کا ثبوت دے تاکہ اس کو مستقل طور پر جنت کی حسین اور لذیذ دنیا میں بسایا جائے۔ جو چیز آج ہے وہ کل نہیں مل سکتی۔ اور جو چیز کل ملنے والی ہے اس کو آج پانے کی کوشش کرنا بے سود ہے۔ انھیں دو لفظوں میں زندگی کا سارا راز چھپا ہوا ہے۔

نوٹ : یہ اس انگریزی مقالہ کا اردو ترجمہ ہے جو کریبین اسلامک کانفرنس (باربیڈوز) میں ۲ اپریل ۱۹۸۳ کو پڑھا گیا۔

اسلام اور عصر حاضر

حصہ اوّل

موجودہ زمانہ کے تمام انسانی مسائل، براہ راست یا بالواسطہ طور پر صرف ایک چیز کا نتیجہ ہیں ــــ خدا اور انسان کے درمیان جدائی۔ دورِ جدید نے انسان کو مادی ساز و سامان تو بہت دئے مگر اس کے خدا کو اس سے چھین لیا۔ اس طرح اس نے جدید انسان کے جسم کے لئے خوراک کا انتظام کیا اور روح کو فاقہ کی حالت میں چھوڑ دیا۔ روح کو اگر جسم سے کامل طور پر جدا کر دیں تو جسم کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ اور اگر ایسا کریں کہ روح کی جو غذا ہے وہ اسے دینا بند کر دیں تو روح فاقہ کی حالت میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ روح کے فاقہ سے روح پر وہ سب کچھ گذرنے لگتا ہے جو جسم کے فاقہ سے جسم پر گذرتا ہے۔ یہی وہ بات ہے جو قرآن میں ان لفظوں میں بیان ہوئی ہے: الا بذکر اللہ تطمئن القلوب (الرعد ۲۸)۔ یہی بات حضرت مسیح نے اپنے مخصوص انداز میں اس طرح بیان فرمائی: آدمی صرف روٹی ہی سے جیتا نہ رہے گا بلکہ ہر بات سے جو خدا کے منہ سے نکلتی ہے (متی ۴ : ۴)

اسلام کے پاس آج کے انسان کو دینے کے لئے جو سب سے بڑی چیز ہے وہ یہی خدا کا عقیدہ ہے اگرچہ تمام مذاہب اصلاً خدا ہی کے مبلغ تھے۔ مگر بعد کے زمانہ میں وہ خدا کے تصور کو اپنی صحیح صورت میں محفوظ نہ رکھ سکے۔ کسی نے خدا کو اپنا قومی خدا بنا لیا۔ کسی نے اس میں شرک کی ملاوٹ کر دی۔ کسی نے خدا کو مجرد فلسفیانہ تخیل بنا کر رکھ دیا۔ اس طرح یہ مذاہب اس قابل نہ رہے کہ خدا کو اس کی واقعی حیثیت میں لوگوں کے سامنے پیش کر سکیں (یونس ۱۹) اب صرف اسلام ہی وہ دین ہے جس کے یہاں خدا کا تصور اپنی صحیح اور کامل صورت میں محفوظ ہے۔ اس لئے جدید انسان کو اس کا مطلوب خدا صرف اسلام کے یہاں مل سکتا ہے (آل عمران ۸۵)

روحانی فاقہ

جدید تہذیب نے انسان کو خدا سے محروم کر کے اس کو روحانی فاقہ میں مبتلا کر دیا ہے۔ اسی روحانی فاقہ کا نتیجہ ہے کہ موجودہ جاپان کے نوجوان، صنعتی ترقی کی انتہا پر پہنچ کر یہ کہنے لگے ہیں کہ "ہمارا کلچر ایک مرچنٹ کلچر ہے اور صرف مرچنٹ کلچر انسان کے لئے کافی نہیں"۔ مغربی سوسائٹی کا وہ مظہر جس کو ہپی ازم کہتے ہیں وہ بھی اسی فاقہ زدگی کی ایک مثال ہے۔

ایک ہپی نوجوان دہلی کی سڑک پر پیدل چل رہا تھا۔ اس کے جسم پر نہایت معمولی ہندستانی

لباس تھا اور گلے کے ساتھ لٹکتی ہوئی ایک چھوٹی سی ڈھول۔ نوجوان سے اس کا وطن پوچھا گیا تو اس نے بتایا کہ وہ کناڈا کا رہنے والا ہے۔ مزید سوالات کے دوران اس نے کہا: کناڈا میں میرے پاس ذاتی مکان اور ذاتی کار تھی۔ ایک اچھی بیوی تھی۔ معقول روزگار تھا۔ یہاں میرے پاس کوئی مکان نہیں جہاں بھی مجھے نیند آتی ہے میں سو جاتا ہوں، خواہ وہ ایک فٹ پاتھ ہو۔ میرے پاس اپنی سواری نہیں، روزگار نہیں۔ میری بیوی نے مجھے چھوڑ دیا ہے۔

"یہاں آپ کو جب اتنی تکلیف ہے تو پھر آپ نے کناڈا کو چھوڑ کر انڈیا آنا کیوں پسند کیا،، اس کے جواب میں مغربی نوجوان نے نہایت سنجیدگی سے رک رک کر یہ الفاظ کہے: وہاں میں جسمانی طور پر مطمئن تھا، یہاں میں روحانی طور پر مطمئن ہوں:

There I was comfortable physically, here I am comfortable spiritually.

جدید تہذیب نے انسان کو بے شمار مادی چیزیں دیں۔ مگر یہ چیزیں اس کے وجود کے صرف "نصف حصہ،، کو تسکین دے سکتی تھیں۔ بقیہ نصف کے لئے ان میں کوئی تسکین موجود نہیں تھی۔ جدید مشینی تہذیب کا یہی وہ تضاد ہے جس نے وہ تمام مظاہر پیدا کئے جن کو موجودہ زمانہ میں ہپی ازم، بورڈم، ان رسٹ وغیرہ کہا جاتا ہے۔ اور جس کو پیس آف مائنڈ کو کھونا کہتے ہیں۔ یہاں مشہور ماہر نفسیات کارل ینگ (۱۹۶۱-۱۸۷۵) کا تجربہ قابل نقل ہے۔ انھوں نے کہا:

"پچھلے تیس برسوں میں روئے زمین کے تمام متمدن ممالک کے لوگوں نے مجھ سے (اپنے نفیاتی امراض کے سلسلہ میں) مشورہ حاصل کرنے کے لئے رجوع کیا ہے۔ میرے مریضوں میں زندگی کے نصف آخر میں پہنچنے والے تمام لوگ جو کہ ۳۵ سال کے بعد کہی جا سکتی ہے، کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں تھا جس کا مسئلہ اپنے آخری تجزیہ میں زندگی کا مذہبی نقطۂ نظر پانے کے سوا کچھ اور ہو۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ان میں سے ہر شخص کی بیماری یہ تھی کہ اس نے وہ چیز کھو دی تھی جو کہ موجودہ مذاہب ہر دور میں اپنے پیروؤں کو دیتے رہے ہیں۔ اور ان مریضوں میں سے کوئی بھی حقیقۃً اس وقت تک شفایاب نہ ہو سکا جب تک اس نے اپنا مذہبی تصور دوبارہ نہیں پالیا،،

Quoted by C.A. Coulson, *Science & Christian Belief*, p. 110

علیٰحدگی کا عمل

قدیم زمانہ میں انسانی ذہن پر فلسفہ کا غلبہ تھا۔ فلسفہ چیزوں کو مکمل طور پر سمجھنے پر زور دیتا تھا۔ وہ اشیاء کے ظاہر سے گذر کر اس کے باطن تک پہنچ جانا چاہتا تھا۔ تاہم پانچ ہزار سالہ کوشش کے باوجود فلسفہ کو اس مقصد میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔

سولھویں صدی عیسوی میں جب یورپ میں سائنسی مطالعہ کا آغاز ہوا تو سائنس دانوں نے اس کو اپنے لئے مفید سمجھا کہ وہ چیزوں کی حقیقت کو اس کی خاصیت سے جدا کر دیں۔ انھوں نے علم کی دو قسمیں قرار دیں:

۱. چیزوں کا علم (Knowledge of Things)
۲. حقیقتوں کا علم (Knowledge of Truths)

انھوں نے اپنے مطالعہ کے دوران محسوس کیا کہ حقیقت کے بارہ میں قطعی علم تک پہنچنا ان کے لئے ممکن نہیں۔ کیوں کہ حقیقت ہمیشہ اتنی لطیف ہوتی ہے جس کو انسانی پیمانوں سے ناپا اور تولا نہیں جاسکتا (الاسرار ۸۵) چنانچہ انھوں نے عملی موقف اختیار کرتے ہوئے حقیقت کو اپنی تحقیق کے دائرہ سے باہر قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ ہم صرف "کیا" کے سوال کو لیں گے، ہم "کیوں" کے سوال پر غور نہیں کریں گے۔ اس طرح انھوں نے اپنی تحقیق کو صرف چیزوں کے علم تک محدود رکھا جس کا قطعی علم حاصل کیا جاسکتا تھا۔

یہ طرز فکر تاریخ میں کام کرتا رہا۔ اولاً گلیلیو (۱۶۵۰ - ۱۵۹۶) کے زمانہ میں پھول کی خوشبو کو پھول کی کیمسٹری سے جدا کیا گیا تھا۔ اس کے بعد ڈیکارٹ (۱۶۵۰ - ۱۵۹۶) نے ثنویت (Dualism) کے اس اصول کی توسیع کی اور اس کو انسان کے مطالعہ میں استعمال کیا۔ اس نے روح کو الگ کر کے جسم کا مطالعہ شروع کیا۔ انسان کے روحانی حصہ کو اس کے وجود کے مادی حصہ سے الگ کر دیا گیا۔

مذکورہ ثنویت سے مادی سائنس کے میدان میں بظاہر کوئی نقصان نہیں ہوا تھا۔ کیونکہ مقناطیس کے گرد مقناطیسی میدان (Magnetic Field) کی حقیقت کو سمجھے بغیر بھی یہ ممکن تھا کہ عملی طور پر مقناطیس کو بجلی پیدا کرنے اور موٹر چلانے کے لئے استعمال کیا جائے۔ مگر جب اس ثنویت کو انسان کے اوپر استعمال کیا گیا تو اس کے زبردست نقصانات ہوئے۔ کیوں کہ بے جان مادہ کی دنیا میں ثنویت چل سکتی ہے۔ مگر انسان ثنویت کو قبول نہیں کرتا۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ کسی آدمی کا پتھر کا اسٹیچو ہو اور اس کو آپ ایک تاریک کوٹھری میں بند کر دیں تو اسٹیچو کے لئے کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوگا۔ مگر انسان ایک نفسیاتی وجود ہے۔ اس لئے اگر زندہ انسان کو اس قسم کی کوٹھری میں بند کیا جائے تو یہ اس آدمی کو ہلاک کرنے کے ہم معنی بن جاتا ہے۔ اسٹیچو کو آپ آزادی سے محروم کر سکتے ہیں اور وہ کوئی ردعمل ظاہر نہیں کرے گا۔ لیکن اگر انسان کو اس کی آزادی سے جدا کر دیں تو اس کی پوری شخصیت تہس نہس ہو جائے گی۔

مادہ کو اس کی معنویت سے اور جسم کو اس کی روح سے علٰحدہ کرنے کا یہ معاملہ جو مغرب میں پیش

آیا اس نے وہ ذہنی زمین فراہم کردی جس میں خدا اور انسان کی وہ علیحدگی ممکن ہو سکے جو بعد کو مغرب میں پیش آئی۔

مسیحیت اور اسلام کا فرق

سائنسی تحقیق کا کام جب مسلم اسپین سے نکل کر اٹلی اور فرانس اور برطانیہ میں پہنچا اور وہاں اس کے لئے کام ہونے لگا تو جلد ہی ایک تیسرا فریق اس کی راہ میں رکاوٹ بن گیا جو اس سے پہلے نہیں ہوا تھا۔ یہ مسیحی چرچ تھا۔ مسیحیت جب فلسطین اور شام سے نکل کر یورپ میں داخل ہوئی تو اس کا سابقہ ارسطو کے افکار سے پیش آیا۔ چرچ نے اس کا مقابلہ کرنے کے بجائے خود اپنے علم کلام کو ارسطو کے منطقی نظام پر ڈھال لیا۔ حتیٰ کہ چند سو سال گذرنے کے بعد وہ ان کے یہاں مقدس بن گیا۔ بعد کو جب سائنسی تحقیقات نے بتایا کہ ارسطو کے افکار محض قیاسی اور بے بنیاد تھے، ان کا حقیقت واقعہ سے کوئی تعلق نہیں، تو چرچ نے محسوس کیا کہ اگر یہ نظریہ رائج ہوا تو اس کا عقائد کا نظام مشتبہ ہو جائے گا۔ اس نے اپنی غلطی کو ماننے کے بجائے طاقت کو استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس زمانہ میں مسیحی چرچ کو یورپ میں زبردست اقتدار حاصل تھا۔ چنانچہ اس نے بزور جدید سائنس کو دبانا شروع کیا۔ تاہم بھیانک مظالم کے باوجود چرچ کو اس میں کامیابی نہ ہو سکی۔

پندرھویں صدی عیسوی سے پہلے کے زمانہ میں سائنس کا ارتقا ر مسلم دنیا میں ہوا۔ اس وقت اسپین اور دوسرے مسلم علاقے سائنسی تحقیقات کا مرکز تھے۔ اس زمانہ میں سائنس اور مذہب کے درمیان کوئی ٹکراؤ پیش نہیں آیا۔ کیوں کہ سچے مذہب اور سچے علم میں کوئی ٹکراؤ نہیں ہے۔ جس خدا نے دین کی وحی کی ہے، اسی نے اس کائنات کو بنایا ہے جس کی تحقیق سائنس کرتی ہے۔ پھر وحی اور علم میں ٹکراؤ کیوں کر ہو سکتا ہے۔ مگر بعد کے مرحلہ میں سائنس کا ارتقار یورپ میں ہوا۔ یہاں مذہب کی نمائندگی کرنے کے لئے مسیحیت تھی جو تحریفات اور الحاقات کی بنا پر اپنی اصل ابتدائی شکل کھو چکی تھی۔ اسلام اور سائنس کے درمیان ٹکراؤ نہ ہونا اور مسیحیت اور سائنس کے درمیان زبردست ٹکراؤ ہو جانا، دونوں دینوں کے درمیان اسی فرق کا براہ راست نتیجہ ہے۔

اس معاملہ میں اسلام اور عیسائیت کے فرق کو سمجھنے کے لئے ایک تقابلی مثال لیجئے۔

زمین اور سورج کی گردش کے بارہ میں قدیم یونان میں دو نظریے پیش کئے گئے تھے۔ ایک ارسطو کا نظریہ، جس کا مطلب یہ تھا کہ زمین قائم ہے اور سورج اس کے گرد گھوم رہا ہے۔ دوسرا ارسٹارکس کا نظریہ، جس کے مطابق زمین سورج کے گرد گھوم رہی تھی۔

ارسطو کا مرکزیت زمین کا نظریہ (Geocentric theory) عیسائیوں میں بہت مقبول ہوا۔ اس نظریہ میں زمین کو بنیادی اہمیت حاصل ہو رہی تھی۔ اور چوں کہ انھوں نے حضرت مسیح کو خدائی کا مقام دے رکھا تھا اس لئے انھیں یہ بات زیادہ صحیح نظر آئی کہ وہی کرہ نظام شمسی کا مرکز بنے جہاں خداوند مسیح پیدا ہوئے ہوں۔ کوپرنیکس (۱۵۴۳-۱۴۷۳) نے جب مرکزیت آفتاب (Heliocentric Theory) کا اصول پیش کیا تو یورپ میں عیسائی پیشواؤں کو اقتدار حاصل تھا۔ انھوں نے اپنے عقیدہ کے تحفظ کے لئے کوپرنیکس کی زبان بند کردی۔ خداوند کی جنم بھومی کو تابع (Satellite) قرار دینا ایک ایسا جرم تھا جس کو مسیحیت کبھی برداشت نہیں کرسکتی تھی۔

مگر یہ مسئلہ بگڑی ہوئی مسیحیت کا تھا نہ کہ حقیقی معنوں میں خدائی مذہب کا۔ چنانچہ مسلمان جو اس اعتقادی پیچیدگی میں مبتلا نہ تھے کہ پیغمبر کو خدا سمجھنے لگیں، انھوں نے مرکزیت آفتاب کے نظریہ کو زیادہ معقول پاکر اس کو قبول کرلیا۔ ان کے یہاں یہ سوال نہیں اٹھا کہ شمسی مرکزیت کا نظریہ مذہبی تعلیمات سے ٹکراتا ہے۔ پروفیسر برنس نے لکھا ہے:

> The Saracens were brilliant astronomers, mathmeticians, physicists, chemists, and physicians... despite their reverance for Aristotle, they did not hesitate to criticize his notion of a universe of concentric spheres with the earth at the centre, and they admitted the possibility that the earth rotates on its axis and revolves around the sun.— Edward Mc Nall Burns, *Western Civilizations*, W.W. Narton & Company Inc. N Y, p. 264

مسلمان فلکیات۔ ریاضی، طبیعیات، کیمیا اور طب میں نہایت باکمال عالم تھے۔ ارسطو کے احترام کے باوجود انھوں نے اس میں تامل نہیں کیا کہ وہ اس کے اس نظریہ پر تنقید کریں کہ زمین مرکز ہے اور سورج اس کے گرد گھوم رہا ہے۔ انھوں نے اس امکان کو تسلیم کیا کہ زمین اپنے محور پر گھومتی ہوئی سورج کے گرد گردش کر رہی ہے۔

مسیحیت میں تبدیلی

مسیحیت جب شام اور فلسطین سے نکل کر یورپ میں داخل ہوئی تو وہاں یونانی نظریات کا غلبہ تھا۔ مسیحی علماء نے یہاں تبلیغی مصلحت کی خاطر وہ عمل کیا جس کو قرآن میں مضاہاۃ (التوبہ ۳۰) کہا گیا ہے۔ انھوں نے مسیحیت کو لوگوں کے لئے قابل قبول بنانے کی خاطر اس کو مروجہ افکار کے مطابق ڈھالنا شروع کیا۔ اس زمانہ میں زیوس (Zeus) یونانیوں کا سب سے بڑا دیوتا تھا جس کو وہ خدا کا اکلوتا بیٹا سمجھتے تھے۔ اس کی نقل کرتے ہوئے وہ بھی حضرت مسیح کو خدا کا اکلوتا بیٹا کہنے لگے۔ اسی طرح اس زمانہ کے جغرافی اور طبیعی نظریات

کو بھی انھوں نے کتاب مقدس کی تفسیر کے طور پر لے لیا اور اس کو اپنی مذہبی کتابوں میں اس طرح درج کر لیا جیسے کہ وہ بھی آسمان سے اترے ہوں۔

مسیحیوں کی خوش قسمتی سے اسی زمانہ میں رومی بادشاہ قسطنطین نے مسیحیت قبول کر لی۔ وہ ۳۰۶ء سے لے کر ۳۳۷ء تک عظیم رومی سلطنت کا شہنشاہ رہا۔ اس نے اپنے شاہی اثرات کے تحت تمام یورپ میں مسیحیت پھیلا دی۔ یہ لوگ جنھوں نے مسیحیت قبول کی انھوں نے کسی ذہنی اور فکری انقلاب کے ذریعہ مسیحیت نہیں قبول کی تھی بلکہ صرف حکومت کے زور پر قبول کی تھی۔ ان کا حقیقی ذہن اب بھی وہی رہا جو پہلے تھا۔ چنانچہ انھوں نے مسیحیت کو اپنے سابقہ خیالات کے مطابق ڈھالنا شروع کیا۔ اس طرح بالآخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ مسیحیت کے نام سے ایک ایسا مذہب وجود میں آگیا جس کا حضرت مسیح کی انجیل سے بہت کم تعلق تھا۔ یہ گویا رومی اور یونانی مذہب تھا جس کو مسیحیت کا نام دے کر اختیار کر لیا گیا۔ اڈولف ہارنک نے صحیح لکھا ہے کہ چوتھی صدی تک انجیل یونانی فلسفہ کے رنگ میں رنگ چکی تھی:

By the fourth century the living gospel had been masked in Greek philosophy

مذہب میں جب کوئی چیز عرصہ تک جاری رہے تو وہ مقدس بن جاتی ہے۔ چنانچہ یہ بدلی ہوئی مسیحیت چند سو سال کے بعد مقدس بن گئی۔ جو چیز ابتداءً مصلحت کے تحت اختیار کی گئی تھی وہ مسیحیت کا حقیقی حصہ سمجھی جانے لگی۔ حتی کہ یونانیوں کے بے اصل علوم مسیحی علوم کہے جانے لگے۔ مثلاً مسیحی جغرافیہ (Topography Christian) وغیرہ۔

Adalf Harmack, Outline of the History of Dogma.

مذہب اور زندگی کی علیحدگی

مسلمانوں کے زوال کے بعد جب یورپ میں جدید تحقیق کا کام شروع ہوا تو "مسیحی علوم" کی غلطی واضح ہونے لگی۔ جدید علماء نے جب فلکیات اور جغرافیہ اور طبیعیات سے متعلق اپنی تحقیقات شائع کیں تو مذہبی حلقوں میں کھلبلی مچ گئی۔ مسیحی چرچ نے اولاً ان علماء کی بے دینی کے فتوے دئے۔ جب اس سے لوگوں کی زبانیں بند نہیں ہوئیں تو پوپ کے حکم خاص سے احتساب کی عدالت (Inquisition) قائم ہوئی۔ اندازہ ہے کہ تقریباً تین لاکھ آدمیوں کو مسیحی احتساب کی عدالت میں کھڑا ہونا پڑا۔ ان کو سخت سزائیں دی گئیں۔ تقریباً ۳۰ ہزار آدمیوں کو زندہ جلا دیا گیا۔ ان سزا یافتگان میں گلیلیو اور برونو (Brunoe) جیسے لوگ بھی شامل تھے۔

اس کے نتیجہ میں چرچ اور سائنس کے درمیان جنگ شروع ہوئی جو بالآخر علم اور مذہب کی جنگ

بن گئے۔ مفروضہ مقدس عقائد پر بے جا اصرار کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں میں یہ خیال عام ہو گیا کہ علم اور مذہب دونوں ایک دوسرے کے ضد ہیں۔ ایک کی ترقی دوسرے کے لئے موت کا حکم رکھتی ہے۔ قرآن کے مطابق علم اللہ سے قریب کرنے والی چیز ہے (فاطر ۲۸) مگر مسیحی تحریفات کا نتیجہ یہ ہوا کہ علم لوگوں کو اللہ سے دور کرنے والا بن گیا۔

علم اور مذہب کا یہ تصادم تقریباً دو سو برس تک جاری رہا۔ یہاں تک ۱۸۵۹ میں چارلس ڈارون نے اپنی کتاب (Origin of Species) شائع کی۔ چرچ نے اس کی زبردست مخالفت کی۔ مگر اب چرچ کا زور گھٹ چکا تھا۔ بالآخر دونوں کے درمیان (Secularism) کی صورت میں سمجھوتہ ہو گیا۔ مذہب اور علم کے دائرے ایک دوسرے سے الگ کر دئے گئے۔ مذہب کو شخصی دائرہ کی چیز قرار دے کر بقیہ تمام شعبوں میں انسان کے لئے آزادی کا حق تسلیم کر لیا گیا کہ وہ جو چاہے کرے اور جس طرح چاہے اپنی تحقیق چلائے۔

مذہب ایک رسمی ضمیمہ

تاہم یہ علیٰحدگی محض علم اور مذہب کی علیٰحدگی نہ تھی بلکہ یہ زندگی اور مذہب کی علیٰحدگی تھی۔ چرچ نے یہ نہیں کیا کہ جن غیر آسمانی افکار و خیالات کو اس نے اپنے مذہب میں شامل کیا تھا ان کو وہ اپنے مذہب سے خارج کر دے۔ ان کی ساری نامعقولیت کے باوجود وہ ان کو اپنے مذہب کا جزء بنائے رہا۔ ایسی حالت میں مذہب کو شخصی دائرہ میں جگہ ملنا بھی ناممکن تھا۔ کیوں کہ آدمی ایک سوچنے سمجھنے والی مخلوق ہے۔ جس چیز کی معنویت آدمی کے اوپر واضح نہ ہو اس کو وہ شخصی طور پر بھی اپنی زندگی کا جزء نہیں بنا سکتا۔ اس تقسیم کا لازمی نتیجہ یہ ہونا تھا کہ مذہب زندگی کا صرف ایک رسمی ضمیمہ بن جائے، وہ کسی کی زندگی میں حقیقی طور پر شامل نہ ہو سکے۔

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ خدا نے کسی آدمی کے سینے میں دو دل نہیں بنائے (الاحزاب ۴) یعنی یہ انسانی فطرت کے خلاف ہے کہ دو غیر ہم آہنگ فکر یکساں قوت کے ساتھ آدمی کے ذہن میں جمع ہوں۔ جو چیز علمی اور فکری معیار پر پوری نہ اترے وہ کسی شخص کی زندگی کا ایک غیر موثر ضمیمہ تو بن سکتی ہے مگر وہ ایک زندہ عنصر کی حیثیت سے کبھی اس کی زندگی میں جگہ نہیں پا سکتی۔ مذہب کو شخصی طور باقی رکھنے کے لئے بھی اس کا مطابق عقل ہونا ضروری ہے۔ جو مذہب عقل کے مطابق نہ ہو وہ شخصی سطح پر بھی اپنے وجود کو باقی رکھنے میں کامیاب نہیں ہو گا۔ ایسا مذہب کسی آدمی کے ہاتھ میں بس "چھنگلیا" بن کر رہ جائے گا۔ وہ اس کے ہاتھ کا "انگوٹھا" نہیں بن سکتا۔

فطرت انسانی کا تقاضا

جسم اور روح کی علیحدگی اور اس کے بعد خدا کو انسانی زندگی سے جدا کرنے کے نتیجہ میں تاریخ میں پہلی بار انسان کے سامنے یہ مسئلہ آیا ہے کہ سامان حیات کی افراط کے درمیان انسان احساس محرومی سے دوچار ہے۔ آج انسان کی صورت میں ہمارے سامنے ایک ایسا وجود ہے جس کو سب کچھ فراہم کرنے کے بعد بھی اس کے چہرے پر حقیقی خوشی دیکھنا ہمارے لئے مقدر نہیں۔ برٹرینڈ رسل (۱۸۷۲-۱۹۷۰) اپنی کتاب (The Conquest of Happiness) کا آغاز ان الفاظ میں کرتا ہے کہ جانور اس وقت تک خوش رہتے ہیں جب تک وہ صحت مند ہوں اور انہیں خوراک حاصل ہو۔ انسان کو بھی ایسا ہی ہونا چاہئے۔ مگر جدید دنیا میں انسان خوش نہیں، کم از کم اکثریت کا حال یہی ہے:

> Animals are happy so long as they have health and enough to eat. Human beings, one feels, ought to be, but in the modern world they are not, at least in a great majority of cases.

اس کی وجہ یہ ہے کہ جدید تہذیب نے اپنی عظیم کامیابیوں کے باوجود انسان کی طلب کا صرف نصف حصہ فراہم کیا ہے اس نے "جسم" کے تقاضے فراہم کئے۔ مگر وہ "روح" کے تقاضے فراہم کرنے میں ناکام رہی۔

انسان معنویت چاہتا ہے اور جدید تہذیب اس کو صرف پتھر کا ایک ٹکڑا دیتی ہے۔ انسان زندگی چاہتا ہے اور جدید تہذیب اس کو انسان کی صورت میں ایک اسٹیچو فراہم کرتی ہے۔ انسان قلب و دماغ کی تسکین چاہتا ہے اور جدید تہذیب اس کو مشین کی بے روح گاڑی میں بٹھا کر چھوڑ دیتی ہے۔ انسان خالق کائنات سے ملنا چاہتا ہے اور سائنس اس کو مخلوق تک پہنچا کر اپنی سواری سے اتار دیتی ہے۔ انسان چاہتا ہے کہ اپنے محسن کو سجدہ کرے۔ مگر سائنس نے جو دنیا بنائی ہے اس میں اس کو کہیں اپنا محسن نظر نہیں آتا۔ حتیٰ کہ وہ حقیقی خدا کو نہ پاکر مفروضہ خداؤں کے آگے جھکنے لگتا ہے۔ مگر یہ ویسا ہی ہے جیسے کسی ماں کے یہاں اولاد نہ ہو تو وہ پلاسٹک کی گڑیا لے کر اپنی گود میں دبا لے۔ دوسرے تمام معبود قرآن کے الفاظ میں اسماء (یوسف ۴۰) ہیں نہ کہ حقیقتیں۔

انسان کے لئے ایک برتر خدا کی ضرورت اتنی مسلم ہے کہ وہ مفکرین بھی اس کی اہمیت تسلیم کرتے ہیں جو اپنے ذوق کے مطابق خدا اور مذہب کو ماننا پسند نہیں کرتے۔ مثال کے طور پر برٹرینڈ رسل نے لکھا ہے کہ اگر زندگی کو پورے معنوں میں انسانی زندگی بننا ہے تو اس کا کوئی مقصد ہونا چاہیے جو خود انسانی زندگی سے باہر ہو۔ ایسا مقصد جو غیر شخصی ہو اور انسانیت سے بلند تر ہو۔ مثلاً خدا، صداقت یا حسن:

If life is to be fully human it must serve some end which seems in some sense, outside human life, some end which is impersonal and above mankind, such as God or truth or beauty.
Bertrand Russell, *Principles of Social Reconstruction*,
London, George Allen & Unwin Ltd. 1923, P. 215

یہ ایک منکر خدا کی زبان سے خدا کی فطری ضرورت کا اقرار ہے۔ دور جدید کے انسان کی محرومی یہ ہے کہ اس نے اپنے خدا کو کھو دیا ہے۔ اب اس کی نجات صرف اس میں ہے کہ دوبارہ وہ اپنے خدا کو پالے۔

علم الانسان کے ماہرین نے مختلف انسانی معاشروں کا مطالعہ کیا ہے۔ کئی ہزار سال کے تاریخی ریکارڈ کو سامنے رکھ کر انھوں نے انسان کی فطرت کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا متفقہ بیان ہے کہ انسان کی فطرت میں خدا کا تصور پیوست (Interwoven) ہے جس طرح بکری سے گھاس اور بلی سے گوشت کھانے کی جبلت کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح خدا کو انسانی فطرت سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔

موجودہ زمانہ میں اس کی ایک مثال کمیونسٹ سوسائٹی ہے۔ روس میں کمیونسٹ انقلاب ۱۹۱۷ میں آیا۔ اس کے بعد روسی معاشرہ سے خدا کو نکال دیا گیا۔ تعلیم و تربیت کے تمام شعبے انکار خدا کی بنیاد پر قائم کئے گئے۔ مگر روس کی جدید نسل جو مکمل طور پر بے خدا انظام میں پیدا ہوئی ہے اور بے خدا تعلیم و تربیت کے تحت پلی اور بڑھی ہے، اس کے اندر بھی خدا کا شعور نہایت گہرائی کے ساتھ پیوست ہے۔

۱۹۷۳ کا واقعہ ہے۔ ایک روسی جہاز (Ilyushin Jet) ہندستان کی مشرقی سرحد پر اڑ رہا تھا کہ اس کا انجن خراب ہو گیا اور وہ بنگال میں گر پڑا۔ بعد کو جب جہاز کی دم سے (Black Box) نکالا گیا اور اس کو (Replay) کیا گیا تو معلوم ہوا کہ آخری لمحات میں نوجوان روسی پائلٹ کی زبان سے جو لفظ نکلا وہ یہ تھا کہ پیٹر ہم کو بچا:

Peter save us.

عجز کی تلافی

انسان کی زندگی کچھ اس ڈھنگ پر بنی ہے کہ وہ مستقل طور پر عجز (Helplessness) کے احساس میں مبتلا رہتا ہے۔ اس سے کوئی بھی شخص مستثنیٰ نہیں خواہ وہ عالم ہو یا جاہل، امیر ہو یا غریب، بڑا ہو یا چھوٹا۔

آدمی جسمانی اعتبار سے اتنا کمزور ہے کہ ایک معمولی حادثہ بھی اس کو زخمی کر دینے کے لئے کافی ہے۔ اس کو زندہ رہنے کے لئے ایک بے حد متوازن جغرافیہ درکار ہے۔ جغرافی توازن میں بگاڑ کو وہ برداشت

نہیں کر پاتا۔ وہ جس کائنات میں ہے وہ اتنی زیادہ بڑی اور وسیع ہے کہ اس کے مقابلہ میں انسان اپنے آپ کو حد درجہ حقیر پاتا ہے۔ کوئی شخص علمی میدان میں تحقیق کر رہا ہو تو اس پر کھلتا ہے کہ حقائق اس سے زیادہ وسیع اور پیچیدہ ہیں کہ اس کی محدود عقل ان کا احاطہ کر سکے۔ ایک آدمی جب کوئی کام کرتا ہے تو اس کو تجربہ ہوتا ہے کہ اکثر اوقات لامعلوم اسباب (Unknown Factors) حائل ہو کر اس کے کام کو بگاڑ دیتے ہیں۔ اور اگر بالفرض کوئی خوش قسمت آدمی ان تلخ تجربات سے بچ جائے تو موت سے وہ اپنے آپ کو نہیں بچا پاتا۔ موت کا حملہ بالکل یک طرفہ ہوتا ہے۔ موت آدمی کے گھروندہ کو اس طرح تہس نہس کر دیتی ہے جیسے ایک سخت زلزلہ کسی پر رونق شہر کو اچانک ملبہ کا ڈھیر بنا دے۔

یہ احساس عجز ہر آدمی کا پیچھا کر رہا ہے۔ یہ چیز اس کو مجبور کرتی ہے کہ وہ ایک ایسا سہارا پکڑے جو اس سے زیادہ طاقت ور ہو۔ جو اس کے لئے اس کے عجز کی تلافی بن جائے۔ یہی احساس بے چارگی آدمی کو خدا کی طرف لے جاتا ہے۔ آدمی کو ایک ایسا خدا چاہئے جس کے سامنے وہ اپنے جذباتِ شکر کو انڈیل سکے۔ جس کے اوپر وہ اپنے معاملات میں بھروسہ کرے۔ جس کا عقیدہ اس کے لئے اس وقت بھی سہارا بنا رہے جب کہ بظاہر کوئی سہارا نہیں ہوتا۔ جس سے وہ یہ امید کر سکے کہ وہ اس کی ہر بربادی کے بعد اس کو آباد کرے گا۔ اور ہر مشکل کو اس سے رفع فرمائے گا۔ اسلام کا خدا ایسی ہی ایک ہستی ہے جو پورے معنوں میں حقیقی ہے اور اسی کے ساتھ کامل بھی۔

خدا کا تصور مختلف مذاہب میں

آدمی کا یہ احساس عجز اس وقت تک تسکین نہیں پاتا جب تک اس کو "خدا" فراہم نہ کر دیا جائے۔ بظاہر ہر مذہب انسان کو یہی خدا فراہم کر رہا ہے۔ مگر اسلام کے سوا جو مذاہب ہیں وہ سب تحریف اور الحاق اور ضیاع کا شکار ہوتے رہے ہیں۔ چنانچہ خدا کا تصور ان کے یہاں اپنی صحیح شکل میں باقی نہیں رہا ہے۔ اس لئے وہ خدا تو پیش کرتے ہیں مگر وہ ایسا خدا پیش کرتے ہیں جو واقعہ کے مطابق نہ ہونے کی وجہ سے انسان کو پوری تسکین نہ دے سکے۔

کیٹ اسٹیونس (Cat Stevens) بین اقوامی شہرت رکھنے والے پاپ موسیقی کے ماہر تھے۔ انھوں نے ۱۹۷۶ میں مسیحی مذہب کو چھوڑ کر اسلام قبول کر لیا۔ ان کا موجودہ نام یوسف اسلام ہے۔ انھوں نے اپنے قبول اسلام کی کہانی بتاتے ہوئے کہا کہ مسیحی چرچ ہم کو خدا پر عقیدہ رکھنے کی تلقین کرتا ہے۔ مگر خدا سے مربوط ہونے کا مسیحی طریقہ صرف حضرت عیسیٰ کی معرفت ممکن ہے۔ کوئی آدمی خدا سے براہ راست ربط قائم نہیں کر سکتا۔ انھوں نے کہا کہ اسلام کی اہمیت یہ ہے کہ وہ آدمی کو ایسے خدا سے متعارف کرتا ہے جو براہ راست

اپنے بندوں سے باتیں کرتا ہے اور اس کی روح سے اتصال قائم کرتا ہے۔ اسلام میں ہر آدمی براہ راست اپنا ربط خدا سے قائم کر سکتا ہے۔

Monthly Arabia, London, July 1983

انسان کی فطرت ایک ایسا خدا چاہتی ہے جس سے وہ براہ راست مربوط ہو سکے۔ مگر موجودہ مذاہب اس کو ایسا خدا دیتے ہیں جس سے وہ صرف بالواسطہ طور پر مربوط ہو سکتا ہے۔ تمام مذاہب میں صرف اسلام ہے جو انسان کو براہ راست خدا سے ملاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام آج بھی اپنی اصل الہامی شکل میں باقی ہے۔ جب کہ دوسرے مذاہب انسانی ملاوٹ کی وجہ سے اپنی اصل الہامی صورت کو کھو چکے ہیں۔

تمام مذاہب اصلاً ایک تھے۔ مگر اب ان میں انسانی آمیزش کی وجہ سے فرق ہو گیا ہے (یونس ۱۹) کوئی مذہب ایسا ہے جو کئی خدا پیش کر رہا ہے۔ مگر یہ انسانی طلب کے سراسر غیر مطابق ہے۔ کیوں کہ خدا کی طلب ایک ایسی ہستی کی طلب ہے جس کو آدمی اپنا مرکز توجہ بنا سکے۔ اور مرکز توجہ ہمیشہ کوئی ایک چیز بنتی ہے نہ کہ کئی چیز۔ کوئی مذہب کسی انسان کو خدا کے روپ میں پیش کرتا ہے۔ مگر انسان کو جس خدا کی تلاش ہے وہ وہی خدا ہو سکتا ہے جو اس کی اپنی ذات سے برتر ہو، ایسا خدا انسان کا معبود نہیں بن سکتا جو خود اس کے اپنے جیسا ہو۔ کوئی مذہب خدا کو محض ایک روح مجرد (Vague Spirit) کی صورت میں پیش کر رہا ہے۔ مگر انسان ایک دیکھنے اور سننے اور بولنے والے خدا کو چاہتا ہے۔ ایتھر یا قوت کشش جیسی کوئی مجرد چیز اس کی مانگ کو پورا نہیں کر سکتی۔

مشہور مفکر آرتھر کوسلر کو عزت اور مرتبہ حاصل تھا۔ اس کے پاس تقریباً چار لاکھ پونڈ نقد موجود تھے۔ مگر تین شادیوں کے باوجود وہ بے اولاد تھا۔ نیز رعشہ اور خون کے کینسر نے اس کو سخت پریشان کر رکھا تھا۔ چنانچہ اس نے مایوسی کے عالم میں مارچ ۱۹۸۳ میں اپنے لندن کے مکان میں خودکشی کر لی۔ اس وقت اس کی عمر ۷۷ سال تھی۔

اسی طرح ہر روز دنیا بھر میں سیکڑوں آدمی خودکشی کرتے رہتے ہیں۔ خودکشی کے ان واقعات کی وجہ ہوتی ہے ــــــ موجودہ دنیا میں اپنی آرزوؤں کی تکمیل سے مایوسی۔ مگر تاریخ میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ خدا پر سچا عقیدہ رکھنے والوں نے کبھی خودکشی کی ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا کا عقیدہ آدمی کو موجودہ دنیا کے بعد آنے والی دوسری دنیا میں امید عطا کرتا ہے۔ کیوں کہ خدائی اسکیم میں زندگی صرف موجودہ دنیا کی زندگی نہیں ہے۔ وہ موت کے بعد بھی جاری رہتی ہے۔ خدا پر یقین رکھنے والے کو اگر دنیا میں کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ آئندہ زندگی کے ساتھ لو لگا لیتا ہے۔ وہ انسانوں کی دنیا سے مایوس ہو کر خدا کی دنیا

کو اپنی توجہ کا مرکز بنالیتا ہے۔ اس طرح سچے خدا پرست کی تمام پریشانیاں ایک صحت مند رجائیت (Healthy Optimism) میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔

خدا کا بگڑا ہوا تصور

دوسرے مذاہب میں خدا کا جو بگڑا ہوا تصور پایا جاتا ہے وہ انسان کی طلب کا مکمل جواب نہیں بنتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کی نفسیات ایک کامل خدا کی طالب ہے اور یہ مذاہب اس کو ناقص خدا کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔ اس بنا پر اگرچہ ایسا ہوتا ہے کہ اندرونی طلب سے مجبور ہو کر بہت سے لوگ اس کی طرف لپک پڑتے ہیں۔ مگر ان کی حقیقی روحانی تسکین اسی خدا سے ہو سکتی ہے جس کا تصور اسلام میں پیش کیا گیا ہے۔ ایک شخص اپنی سواری کے لئے موٹر کار کا طالب ہو تو آپ اس کو کھلونا گاڑی (Toy Car) دے کر مطمئن نہیں کر سکتے۔ اس کا اطمینان تو اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ اس کو ایک واقعی کار مل جائے۔ اسی لئے قرآن میں کہا گیا ہے الا بذکر اللہ تطمئن القلوب۔ سنو خدا کی یاد ہی سے دلوں کو اطمینان ہوتا ہے۔

خدا اگرچہ ہمارے سامنے نہیں ہے مگر اس کی تخلیق، ایک عظیم کائنات کی صورت میں ہمارے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے۔ ہم اس کو دیکھتے ہیں اور اس کا تجربہ کرتے ہیں۔ ایسی حالت میں انسان کا ذہن کسی ایسے خدا پر ہی مطمئن ہو سکتا ہے جو موجودہ کائنات کے شایان شان ہو۔ جو آدمی کو واقعی اس عظیم کائنات کا خالق دکھائی دے۔ اس سے کم تر درجہ کا خدا انسان کے ذہن کو اپیل نہیں کر سکتا۔

ایک امریکی سائنس داں والٹر آسکر لنڈ برگ نے اس کی ایک دل چسپ مثال دی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "ایک سائنس داں دوسروں کے مقابلہ میں ایک خصوصی موقع (Special Advantage) اس بات کا رکھتا ہے کہ وہ خدا کی سچائی کو سمجھ سکے۔ وہ اساسی اصول جس پر اس کے کام کی بنیاد ہے وہ دراصل خدا کے وجود کا ایک اظہار (An expression of God's existence) ہے" اس کے باوجود سائنس کی تعلیم کے بعد کیوں لوگ خدا کے منکر ہو جاتے ہیں۔ امریکی پروفیسر کے نزدیک، دو میں سے ایک خاص سبب اس کا یہ ہے کہ منظم مسیحیت میں نوجوانوں کے اندر گہرائی کے ساتھ ایک ایسے خدا کا عقیدہ پیوست ہے جو انسانی صورت میں پیدا ہوا نہ کہ ایسا انسان جو خدا کی صورت میں پیدا ہوا۔ اس طرح کے ذہن بعد کو جب سائنس کی تعلیم حاصل کرتے ہیں تو خدا کا یہ الٹا اور محدود تصور دھیرے دھیرے غیر عقلی اور غیر علمی معلوم ہونے لگتا ہے۔ بالآخر جب مطابقت پیدا کرنے کی تمام کوششیں ناکام ہو جاتی ہیں تو اس کے بعد خدا کا یہ تصور مکمل طور پر چھوڑ دیا جاتا ہے؛

In organised Christianity there is instilled deeply in young people a concept of God created in the image of man, rather than of man created in the image of God. When such minds are later trained in science, this reversed and limited anthropomorphic concept gradually becomes more and more incompatible with the rational, inductive attitude of Science. Ultimately when all attempts at reconciliation fail, the concept of God may be abandoned entirely.

The Evidence of God in an Expanding Universe, p. 56

اسلام کوئی نیا دین نہیں ہے۔ اصلاً اور ابتداءً دوسرے مذاہب اور اسلام ایک ہی تھے۔ مگر دوسرے مذاہب میں تبدیلیوں کی وجہ سے صحیح تصور خدا محفوظ نہ رہ سکا۔ جب کہ اسلام میں خدا کا تصور اپنی اصلی اور حقیقی صورت میں محفوظ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ خدا کو صحیح ترین روپ میں پیش کرتا ہے۔ اسلام کا خدا ایک خدا ہے۔ وہ ہر قسم کی طاقتوں کا مالک ہے۔ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ اس نے تنہا پوری کائنات کو پیدا کیا اور وہی تنہا پوری کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے۔ وہ دیکھتا ہے اور سنتا ہے اور بولتا ہے۔ وہ آدمی کی پکار پر ہر وقت اس کا ساتھ دینے کے لئے موجود رہتا ہے۔ اس سے ہر وقت اور ہر مقام پر انسان کا ربط قائم ہو سکتا ہے۔ ہر چیز اس کے قبضۂ اختیار میں ہے۔ وہ موت سے پہلے کے مرحلہ میں بھی آدمی کا مددگار رہے اور موت کے بعد کے مرحلہ میں بھی ——— قرآن اسی خدا کا ایک تعارف ہے جس کو خدا کا کامل تعارف حاصل کرنا ہو اس کو قرآن پڑھنا چاہئے۔

حصہ دوم

موجودہ زمانہ میں تمام قومیں اجتماعی مسائل سے دوچار ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک ہوں یا غیر ترقی یافتہ ممالک، ہر جگہ انسانی معاشرہ ظلم و فساد کا شکار ہے۔ ہر جگہ یہ سوال درپیش ہے کہ معاشرہ کی تنظیم کس طرح کی جائے کہ وہ بہتر انسانی معاشرہ بن سکے۔

انسانی مسائل پر غور کرتے ہوئے سب سے اہم بات جو سامنے آتی ہے وہ یہ کہ انسان ایک ایسی دنیا میں اپنے مسائل کا حل تلاش کرنے کے سوال سے دوچار ہے جہاں بقیہ تمام چیزوں کے مسائل اول روز سے حل شدہ ہیں۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسان نے کائنات کی شاہراہ چھوڑ رکھی ہے۔ اگر وہ خود بھی اسی شاہراہ پر آجائے جس پر بقیہ تمام چیزیں چل رہی ہیں تو اس کے مسائل بھی اسی طرح حل ہو جائیں گے جس طرح بقیہ چیزوں کے مسائل حل ہو چکے ہیں۔

کائنات کی تمام چیزیں ایک ہی آفاقی قانون میں جکڑی ہوئی ہیں۔ مگر انسان کا یہ حال ہے کہ ہر ایک اپنے لئے الگ الگ راستہ اختیار کرنا چاہتا ہے۔ کائنات کی ہر چیز دوسروں کے لئے نفع بخش بن کر زندہ ہے۔ مگر انسان دوسروں کے استغلال پر اپنا مستقبل تعمیر کرنا چاہتا ہے۔ کائنات میں اگر کوئی چیز بلند ہے

تو وہ اپنا سایہ زمین پر ڈال کر تواضع کا اعتراف کرتی ہے۔ مگر انسان کو اگر کوئی بڑائی مل جائے تو وہ گھمنڈ کا اظہار کرتا ہے۔ کائنات میں ہر چیز صرف اپنے کام میں لگی ہوئی ہے، وہ کسی دوسرے سے نہیں ٹکراتی۔ مگر انسان دوسروں سے ٹکراتا ہے۔ وہ دوسرے کی تخریب پر اپنی تعمیر کا منصوبہ بناتا ہے۔ کائنات میں ایسے "سیلاب" آتے ہیں جن کو آزادانہ موقع دیا جائے تو وہ سخت تباہی پھیلائیں۔ مگر کائناتی نظام یہ کرتا ہے کہ ان کا رخ ندیوں اور سمندروں کی گہرائی کی طرف موڑ دیتا ہے۔ اس کے برعکس انسانوں کے یہاں جب منفی جذبات کا طوفان اٹھتا ہے تو وہ اس کے رخ کو نہیں پھیرتے۔ یہاں ہر آدمی صرف یہ جانتا ہے کہ اپنی آفت کو دوسرے کے اوپر ڈال دے۔

معاشرہ کی اصلاح کے سلسلے میں اصل ضرورت یہ ہے کہ اس تضاد کو ختم کیا جائے۔ انسانی معاشرہ کو بھی اسی آفاقی نظام کا پابند بنایا جائے جس میں بقیہ تمام کائنات جکڑی ہوئی ہے۔ جس دن ایسا ہوگا اسی دن انسانی زندگی کے تمام مسائل حل ہو جائیں گے۔ جس قانون کو اختیار کرنے کے نتیجے میں بقیہ کائنات کے مسائل حل شدہ ہیں اسی قانون کو اختیار کرنے سے انسانی زندگی کے مسائل کیوں کر حل نہ ہوں گے۔

اجتماعی مسائل

اجتماع کیا ہے۔ اجتماع دراصل افراد ہی کے مجموعہ کا دوسرا نام ہے۔ سوسائٹی کا سلوک دراصل فرد فرد کے سلوک ہی کا مجموعہ ہوتا ہے۔ افراد صحیح ہوں تو سوسائٹی صحیح ہوگی۔ افراد غلط ہوں تو سوسائٹی بھی غلط ہو جائے گی۔

خدا کا عقیدہ سوسائٹی کے ہر فرد کو صحیح ترین نقطۂ نظر دیتا ہے۔ وہ فرد فرد میں سنجیدگی پیدا کرتا ہے۔ اس طرح وہ ہر فرد کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ وہی کرے جو بحیثیت مجموعی پوری انسانیت کے لئے مفید ہے۔ اور وہ نہ کرے جو مجموعی انسانیت کے لئے مفید نہیں۔

خدا کا عقیدہ عظیم ترین دریافت ہے۔ وہ آدمی کی پوری شخصیت کو ہلا دیتا ہے۔ اس کی مثال کیرم بورڈ سے دی جاسکتی ہے۔ کیرم کے کھیل میں بورڈ کے درمیان ۱۹ گوٹیں ہوتی ہیں۔ کھلاڑی اگر اسٹرائکر کو اس طرح مارے جس سے تمام گوٹوں پر زد پڑ جائے تو ایسی مار کو شاہ ضرب (Master Stroke) کہتے ہیں۔ خدا پر عقیدہ بھی اسی قسم کا ایک ماسٹر اسٹروک ہے۔

خدا پر عقیدہ انسان کی پوری ہستی پر ضرب لگاتا ہے۔ وہ آدمی کی تمام قوتوں کو متحرک بنا دیتا ہے۔ خدا پر عقیدہ بظاہر ایک چیز ہے مگر وہ انسان کو ہر پہلو سے ایک اصلاح یافتہ انسان بنا دیتا ہے۔ اس کے بعد

آدمی اس قابل ہو جاتا ہے کہ اس کی ہستی کا جو پہلو بھی دنیا میں ظاہر ہو وہ درست شکل میں ظاہر ہو، فطرت کے سیدھے راستہ سے وہ کسی حال میں انحراف نہ کرے۔ انسان کا پورا وجود خدا کی پکڑ میں ہے اس لئے خدا کا عقیدہ انسان کے پورے وجود کو متاثر کرنے والا بن جاتا ہے۔

۱۔ روح کو چھوڑ کر صرف جسم پر توجہ دینے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی کے اندر متکامل شخصیت (Integrated personality) نہیں پیدا ہوتی۔ اپنے اندر کمی کا احساس اس کو مستقل طور پر غیر مطمئن رکھتا ہے۔ وہ اس احساس میں مبتلا رہتا ہے کہ اس کو جو کچھ پانا چاہئے تھا وہ ابھی تک اس کو نہ پا سکا۔

یہ احساس محرومی اکثر حالات میں سماجی برائیوں کا سبب ہے۔ سماج کے اندر ظلم و فساد کی حقیقت دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ ایک آدمی اپنی بے چینی کو دوسرے کے اوپر انڈیل دینا چاہتا ہے۔ ایک آدمی اپنی محروم خواہشوں کی تکمیل کے لئے دوسرے کے استغلال کا منصوبہ بناتا ہے مگر جب خدا کا عقیدہ اس کے ذہن میں اتر جائے تو اس کے بعد اس کے اندر متکامل شخصیت پیدا ہوتی ہے۔ وہ نفسیاتی پیچیدگیوں سے آزاد روح (Complex-free soul) بن جاتا ہے جس کو قرآن میں نفس مطمئنہ کہا گیا ہے۔ اس کے بعد اگر اس کے پاس کم ہو تو اس کے اندر احساس کمتری کی برائیاں پیدا نہیں ہوتیں۔ اس کے پاس زیادہ ہو تو وہ احساس برتری کے مرض میں مبتلا نہیں ہوتا۔ وہ ہر حال میں ایک معتدل انسان بنا رہتا ہے۔ اور یقینی طور پر یہی وہ چیز ہے جو کسی شخص کو بہتر سماجی فرد بناتی ہے۔

۲۔ دوسری چیز احساس ذمہ داری ہے۔ احساس ذمہ داری ہمیشہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب کہ آدمی یہ محسوس کرے کہ اس کے اوپر بھی کوئی طاقت ہے جو اس کو اپنی پکڑ میں لے سکتی ہے۔ خدا کو چھوڑنے کے بعد آدمی کے سامنے ایسی کوئی بلند تر طاقت باقی نہیں رہتی جس سے آدمی اندیشہ کرے اور جس کے سامنے جواب دہی کا احساس اس کو مجبور کرے کہ وہ سچائی پر قائم رہے۔

اس کے برعکس جب آدمی قادر مطلق خدا کو مانتا ہے تو اس کے فوراً بعد اس کے اندر یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ مجھے اس کے سامنے جواب دہی کرنی ہے۔ جواب دہی کا خیال اس کو اپنے قول و عمل میں بے حد حساس بنا دیتا ہے۔ یہ جذبہ اس کی پوری زندگی کو منظم کرتا ہے۔ وہ اس کے اوپر نگراں بن جاتا ہے۔ وہ اس کو ظلم اور استحصال (Exploitation) کے راستوں سے بچاتا ہے اور ہمیشہ انصاف اور بھلائی کو اختیار کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ مشہور انگریز جج سر میتھیو ہیل (۱۶۰۹-۱۶۷۶) نے بجا طور پر لکھا ہے کہ "یہ کہنا کہ مذہب ایک فریب ہے، ان تمام ذمہ داریوں اور پابندیوں کو منسوخ کرنا ہے جن سے سماجی نظم کو برقرار رکھا جاتا ہے"

Religion without Revelation, by Julian Huxley, p. 155

کسی سوسائٹی کے بیشتر افراد جب اسلام کے تصور کے مطابق خدا کو اپنے عقیدے میں شامل کریں تو اس کے بعد اجتماعی معاملات میں زبردست تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔ آدمی کا یہ احساس کہ خدا اس کو دیکھ رہا ہے اس کے اندر سے یہ مزاج ختم کر دیتا ہے کہ وہ اندر کچھ ہو اور باہر کچھ۔ ایسے لوگ دوسروں کا استغلال نہیں کرتے، کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ اس کا انھیں حساب دینا پڑے گا۔ ان کی زندگی خود رخی زندگی (Self-oriented life) کے بجائے خدارخی زندگی (God-oriented life) بن جاتی ہے۔

خدا پر ایمان لانا ایک ایسی ہستی پر ایمان لانا ہے جو تمام طاقتوں کا مالک ہے۔ جو انسان کے دلوں تک کا حال جانتا ہے جو انسان سے اس کے تمام کھلے اور چھپے کا حساب لے گا۔ اس طرح خدا پر ایمان لانا آدمی سے اس کی خودی اور سرکشی کو چھین لیتا ہے۔ ایسا آدمی انتہائی سنجیدہ (Sincere) اور کامل طور پر حقیقت پسند بن جاتا ہے۔ یہی چیز ہر قسم کی اصلاح کا راز ہے۔ آدمی اگر سنجیدہ اور حقیقت پسند ہے تو وہ ہر کام کو صحیح طور پر انجام دے گا اور اگر وہ سنجیدہ اور حقیقت پسند نہ ہو تو جو کام بھی اس سے متعلق ہو گا اس کو وہ بگاڑ ڈالے گا ـــــ اسلام کے مطابق خدا کا عقیدہ آدمی کے اندر یہی سنجیدگی اور حقیقت پسندی پیدا کرتا ہے۔

ہماری دنیا میں جو انسان ہیں وہ سب برابر نہیں۔ یہاں کوئی طاقت ور ہے اور کوئی کمزور۔ یہی فرق ہر قسم کے ظلم و فساد پیدا کرتا ہے۔ جو شخص اپنے کو طاقت ور پاتا ہے وہ اس کے اوپر چڑھ دوڑتا ہے جس کو وہ بظاہر کمزور دیکھ رہا ہے۔

خدا پر ایمان برائی کی اس جڑ کو کاٹ دیتا ہے۔ خدا پر ایمان بتاتا ہے کہ اصل معاملہ انسان اور انسان کے درمیان نہیں بلکہ اصل معاملہ خدا اور انسان کے درمیان ہے۔ یہاں ایک طرف خدا ہے جس کے پاس ہر قسم کی طاقتیں ہیں اور دوسری طرف انسان ہے جس کو خدا کے مقابلہ میں کوئی طاقت حاصل نہیں۔ گویا یہاں زیادہ طاقت اور کم طاقت کی تقسیم نہیں بلکہ طاقت اور بے طاقتی کی تقسیم ہے (فاطر ۱۵)

خدا پر ایمان آدمی کے ذہن کو یکسر بدل دیتا ہے۔ ایسا آدمی اپنے معاملہ کو دوسرے انسانوں کی نسبت سے دیکھنے کے بجائے خدا کی نسبت سے دیکھنے لگتا ہے۔ کیونکہ بالآخر جس سے معاملہ پیش آنے والا ہے وہ خدا ہی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی سے وہ تمام ظالمانہ خواہشیں حذف ہو جاتی ہیں جو اپنے معاملہ کو دوسرے انسانوں کی نسبت سے دیکھنے کی وجہ سے مصنوعی طور پر اس کے اندر پیدا ہو گئی تھیں۔ وہ اپنی حقیقی سطح پر آ جاتا ہے۔ وہ انسانِ اصلی (Man cut to size) بن جاتا ہے۔

دو شخص یا دو قوم کے درمیان جب بھی نزاع پیدا ہو تو بیشتر حالات میں غلطی دونوں طرف ہوتی

ہے۔ اب ایسی حالات میں اگر ایک فریق اپنے حصہ کی غلطی مان لے تو دوسرا فریق بھی بآسانی اپنی غلطی کو ماننے پر راضی ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس اگر ایک فریق اپنے حصہ کی غلطی نہ مانے تو دوسرا فریق بھی اپنے حصہ کی غلطی ماننے پر راضی نہیں ہوتا۔ اس طرح جھگڑا بڑھتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اس حد تک پہنچ جاتا ہے جہاں سے واپسی ممکن نہیں ہوتی۔

ایسے تمام معاملات میں اصل مشکل یہ ہوتی ہے کہ جھگڑا پیدا ہوتے ہی دونوں فریق اس کو اپنی عزت (Prestige) کا مسئلہ بنا لیتے ہیں۔ ہر فریق بخوبی جانتا ہے کہ غلطی کا ایک جزء اس کی طرف بھی ہے۔ مگر یہ خیال اس کو اعتراف سے روکے رہتا ہے کہ اگر میں نے اپنی غلطی مان لی تو میری بے عزتی ہو جائے گی۔ اس اندیشہ کی بنا پر دونوں میں سے کوئی فریق اپنی غلطی کے اعتراف کے لئے تیار نہیں ہوتا۔

لیکن اگر دونوں میں سے کوئی ایک ایسا کرے کہ وہ پہل کر کے اپنے حصہ کی غلطی مان لے تو صورت حال فوراً بدل جائے گی۔ جو معاملہ پہلے عزت کا معاملہ تھا وہ اب توازن کا معاملہ بن جائے گا۔ اس کے بعد دوسرے فریق کے لئے اعتراف کرنا اپنے کو نیچا کرنے کے ہم معنی نہیں رہتا بلکہ وہی چیز کرنا بن جاتا ہے جو دوسرا فریق عملاً کر چکا ہے۔ گویا ایک فریق کا اعتراف دوسرے فریق کے اعتراف کو پیشگی طور پر متوازن کر دیتا ہے۔

یہی حقیقت پسندی زندگی کی اصلاح کا سب سے بڑا راز ہے۔ اور یہ حقیقت پسندی صرف خدا پرستی سے پیدا ہوتی ہے۔ خدا پر ایمان دراصل خدا کو کبیر مان کر اپنے آپ کو صغیر کے مقام پر رکھنا ہے۔ یہ ایمان اس حال میں وقوع میں آتا ہے کہ خدا اپنی کبریائی کو منوانے کے لئے ہمارے سامنے موجود نہیں ہوتا۔ اس اعتبار سے یہ کسی انسان کے لئے سب سے بڑی حقیقت پسندی ہے۔ اب جو شخص اس پر راضی ہو جائے کہ ساری بڑائی خدا کی طرف ہے اور ساری چھوٹائی میری طرف، وہ گویا اپنی "کوتاہی" کو آخری حد تک تسلیم کر چکا ہے۔ اور جو شخص اپنی کوتاہی کو آخری حد تک تسلیم کر لے وہ کیسے کسی بات کو عزت کا مسئلہ بنائے گا۔ ایسے آدمی کے لئے ہر دوسرا اعتراف اسی چیز کو چھوٹی سطح پر ماننا ہے جس کو وہ زیادہ بڑی اور آخری سطح پر پہلے ہی مان چکا ہے۔

قدرت کا نظام توازن کے اصول پر قائم ہے۔ توازن کو قائم رکھنے میں قدرت جن تدبیروں سے کام لیتی ہے ان میں سے ایک تحویل (Diversion) ہے۔ یعنی قوت کی فاضل مقدار کو دوسری طرف موڑ دینا۔ بارش کے موسم میں جو پانی برستا ہے اس کی ساری مقدار اگر کھیتوں اور آبادیوں میں رہ جائے تو زبردست نقصان ہو۔ ایسے موقع پر قدرت یہ کرتی ہے کہ پانی کی ضروری مقدار کھیتوں اور آبادیوں کو دے کر بقیہ تمام پانی دریاؤں کی طرف محول (Divert) کر دیتی ہے۔

اسی اصول تحویل کو انسان نے مصنوعی طور پر بند (Dam) کی صورت میں اختیار کیا ہے۔ بند کا مقصد

یہ ہے کہ دریا کے پانی کے بے روک ٹوک بہاؤ پر کنٹرول قائم کیا جائے۔ جب بھی ایسا ہو کہ پانی حد سے بڑھتا ہوا نظر آئے تو اس کے رخ کو موڑ کر دوسری طرف کر دیا جائے تاکہ وہ دریا میں داخل ہو کر طغیانی نہ لاسکے بلکہ علیحدہ سے بنے ہوئے عظیم گڑھے میں جا کر گر جائے جس کو عام طور پر ذخیرۂ آب (Reservoir) کہا جاتا ہے۔ یہی اصول مشینوں میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً اسٹیم انجن میں جب اسٹیم کی مقدار متعینہ حد سے زیادہ ہو جاتی ہے تو اسٹیم کے رخ کو پھیر کر اسے باہر نکال دیا جاتا ہے۔

ایسا ہی کچھ معاملہ انسان کی اجتماعی زندگی کا بھی ہے۔ مختلف انسان جب مل جل کر رہتے ہیں تو ان کے درمیان بار بار شکایت کی باتیں پیدا ہوتی ہیں۔ ایک دوسرے کے خلاف دلوں میں تلخیاں ابھرتی ہیں۔ اگر اس شکایت اور تلخی کو بڑھنے دیا جائے تو اختلاف اور عناد اور مقابلہ کی نوبت آجاتی ہے۔ انسانی جماعت یا انسانی معاشرہ کا درست طور پر کام کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔

ان حالات میں انسان کے لئے بھی ایک ایسی چیز کی ضرورت ہے جس کی طرف اس کے جذبات کے مضر اضافہ کو موڑا جاسکے۔ خدا اور آخرت کا عقیدہ زندگی میں یہی کام کرتا ہے۔ وہ اجتماعیت کو نقصان پہنچانے والے جذبات کو انسان کی جانب سے موڑ کر خدا کی طرف کر دیتا ہے۔

حضرت یوسف کے سوتیلے بھائیوں نے آپ کو باپ سے جدا کر دیا۔ اس کے بعد آپ کے دوسرے سگے بھائی بن یامین کے ساتھ بھی اسی قسم کا حادثہ پیش آیا۔ ان ناخوشگوار واقعات کے بعد قدرتی طور پر حضرت یوسف کے والد حضرت یعقوب کے اندر شدید جذبات پیدا ہوئے۔ آپ اگر اپنے ان جذبات کا نشانہ حضرت یوسف کے سوتیلے بھائیوں کو بناتے تو زبردست انتشار اور اختلاف پیدا ہوتا۔ مگر آپ نے اپنے جذبات کے ہجوم کو خدا کی طرف موڑ دیا۔ آپ نے فرمایا: انما اشکوا بثی وحزنی الی اللہ۔ اسی طرح عمر فاروق رضؓ نے اپنی خلافت کے زمانہ میں اسلامی جنرل خالد بن الولید کو معزول کر دیا۔ یہ خالد بن الولید جیسے شخص کے لئے زبردست جھٹکا تھا۔ مگر انھوں نے اپنے تمام جذبات کو یہ کہہ کر خدا کی طرف موڑ دیا: انی لا اقاتل فی سبیل عمر ولکن اقاتل فی سبیل رب عمر (میں عمر کے راستہ میں نہیں لڑتا بلکہ خدا کے راستہ میں لڑتا ہوں)

یہ کسی انسانی معاشرہ کے لئے عقیدۂ آخرت کی بہت بڑی دین ہے۔ اس کی وجہ سے ایسا ہوتا ہے کہ آدمی اپنی شکایات کی تلافی کے لئے خدا کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ اس نے جو کچھ انسان سے نہیں پایا، اس کو وہ خدا سے پانے کی امید کر لیتا ہے۔ اس طرح خدا پرست آدمی کے منفی جذبات اپنے ہم جنسوں کی طرف رخ کرنے کے بجائے خدا کی طرف محول (Divert) ہوتے رہتے ہیں۔ جو پانی سیلاب بن کر انسانی آبادی کو نقصان

پہنچاتا وہ (Diversion Pool) میں جاکر گرجاتا ہے۔

خاتمہ

اس بحث کو میں جارج برنارڈ شا (۱۹۵۰-۱۸۵۶) کے ایک قول پر ختم کروں گا۔ برنارڈ شا نے ایک بار کہا کہ اگر محمد جیسا کوئی آدمی موجودہ دنیا کا ڈکٹیٹر ہو جائے تو وہ اس کے مسائل کو اس طرح حل کردے گا کہ دنیا میں وہ امن اور خوشی قائم ہو جائے جس کی ہمیں بہت زیادہ ضرورت ہے۔

> If a man like Muhmmad were to assume the dictatorship of the modern world, he would solve its problems in a way that would bring it much needed peace and happiness.

محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کو جس چیز نے محمد بنایا وہ خدا پر کامل ایمان تھا۔ آپ کی زندگی مومن کامل کا نمونہ تھی۔ اس اعتبار سے اگر برنارڈ شا کے الفاظ کو بدل کر یہ کہا جائے تو بالکل درست ہوگا کہ —— آج دنیا میں اگر صحیح طور پر خدا کو ماننے والے پیدا ہو جائیں تو یقیناً دنیا میں امن قائم ہو جائے گا جس کی آج دنیا کو سب سے زیادہ ضرورت ہے۔

جمعیۃ علماء مالیزیا کے تحت کوالالمپور میں ایک اسلامی کانفرنس ہوئی۔ یہاں ۲۵ نومبر ۱۹۸۳ کے پروگرام میں میرا ایک مقالہ (اسلام اور عصر حاضر) رکھا گیا تھا۔ زیر نظر مقالہ اس مقالہ کا اردو ترجمہ ہے جو اس موقع پر پیش کرنے کے لئے انگریزی میں تیار کیا گیا۔

انسان اپنے آپ کو پہچان

اگر کسی مجلس میں یہ سوال اٹھایا جائے کہ آج انسان کا سب سے بڑا مسئلہ کیا ہے تو مختلف لوگ اس کا مختلف جواب دیں گے۔ کوئی کہے گا کہ سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ایٹمی ہتھیاروں کا تجربہ بند کیا جائے، کوئی دنیا کی بڑھتی ہوئی آبادی کو سب سے بڑا مسئلہ قرار دے گا۔ اور کوئی کہے گا کہ پیداوار اور تقسیم کے نظام کو درست کرنا یہ موجودہ انسان کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ غرض طرح طرح کے جوابات سنائی دیں گے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان ابھی انسان کو نہیں جانتا۔ اگر وہ اپنے آپ کو جانتا تو سب کے جوابات ایک ہوتے۔ سب یہ کہتے کہ آج انسان کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ انسان اپنی حقیقت کو بھول گیا ہے۔ وہ اس حقیقت سے غافل ہے کہ اسے ایک روز مرنا ہے اور مرنے کے بعد اپنے مالک کے پاس حساب و کتاب کے لئے جانا ہے۔ اگر ہم زندگی کی حقیقت کو سمجھ لیں تو ہم دنیا کو نہیں بلکہ آخرت کو اصل مسئلہ قرار دیں گے۔

سب سے بڑا مسئلہ

آج بھی دنیا کے بیشتر انسان خدا اور آخرت کو مانتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ اس کے منکر ہوگئے ہوں مگر اس ماننے کا تعلق ان کے عمل سے نہیں ہے۔ حقیقی زندگی میں ہر شخص کے سامنے صرف یہ سوال ہے کہ وہ اپنی آج کی دنیا کو کس طرح کامیاب بنائے۔ اگر ہماری رصدگاہیں کسی روز یہ اعلان کر دیں کہ زمین کی قوت کشش ختم ہوگئی ہے اور وہ چھ ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے سورج کی طرف کھنچی جارہی ہے تو ساری دنیا میں کہرام مچ جائے گا۔ کیوں کہ اس طرح کی ایک خبر کے معنی یہ ہیں کہ چند ہفتوں کے اندر روئے زمین سے ہر قسم کی زندگی کا خاتمہ ہو جائے۔

مگر یہ دنیا ہر آن ایک اس سے زیادہ شدید خطرے سے دوچار ہے اور کوئی نہیں ہے جو اس سے گھبرانے کی ضرورت محسوس کرتا ہو۔ یہ خطرہ کیا ہے؟ یہ قیامت کا خطرہ ہے جو زمین و آسمان کی پیدائش کے روز ہی سے اس کے لئے مقدر ہو چکا ہے اور جس کی طرف ہم سب لوگ نہایت تیزی سے دوڑتے چلے جارہے ہیں۔ عقیدے کی حد تک بھی لوگ اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں۔ مگر ایسے لوگ بہت کم ہیں جو فی الواقع اس کے بارے میں سنجیدگی سے کچھ سوچنے کی ضرورت محسوس کرتے ہوں۔

اگر آپ شام کے وقت کسی کھلے ہوئے بازار میں کھڑے ہو جائیں اور وہاں دیکھیں کہ لوگ کس لئے دوڑ بھاگ کر رہے ہیں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ آج کے انسان کس چیز کو اپنا اصل مسئلہ بنائے ہوئے ہیں۔

ذرا تصور کیجئے بھرے ہوئے بازار میں موٹروں کی آمد و رفت کس لئے ہو رہی ہے، دکان دار کس لئے اپنی دکانیں سجائے ہوئے ہیں۔ انسانوں کے غول کہاں آتے جاتے نظر آتے ہیں۔ لوگوں کی بات چیت کا موضوع کیا ہے اور ایک دوسرے کی ملاقات کس غرض سے ہو رہی ہے، کن چیزوں سے لوگ دل چسپی لے رہے ہیں، ان کی بہترین صلاحیتیں اور ان کے جیب کے پیسے کس مقصد کے لئے خرچ ہو رہے ہیں، جو خوش ہے وہ کیا چیز پاکر خوش ہے اور جو چہرے اداس نظر آتے ہیں، کس چیز کی محرومی نے انھیں اداس بنا دیا ہے۔ لوگ اپنے گھروں سے کیا چیز لے کر نکلے ہیں اور کیا چیز لے کر واپس جانا چاہتے ہیں۔ اگر آپ لوگوں کی مصروفیتوں سے، ان کے منھ سے نکلی ہوئی آوازوں سے، ان سوالات کا جواب معلوم کرسکیں تو اسی سے آپ کو اس سوال کا جواب بھی معلوم ہو جائے گا کہ آج کا انسان کس چیز کو اپنا اصل مسئلہ سمجھتا ہے اور کیا حاصل کرنا چاہتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ بازاروں کی چہل پہل اور مصروف ترین سڑکوں پر انسانوں کی مسلسل آمد و رفت پکار رہی ہے کہ آج کا انسان اپنی خواہشوں کے پیچھے دوڑ رہا ہے، وہ آخرت کو نہیں بلکہ صرف دنیا کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اگر وہ خوش ہے تو اس لئے خوش ہے کہ اس کی دنیوی تمنائیں پوری ہو رہی ہیں۔ اگر وہ غمگین ہے تو اس لئے غمگین ہے کہ اس کی دنیوی خواہشیں پوری ہوتی ہوئی نظر نہیں آتیں۔ آج کی ضرورتیں، آج کا آرام، آج کی عزت، آج کے مواقع، بس انھیں کو پالینے کا نام لوگوں کے نزدیک کامیابی ہے۔ اور انھیں سے محروم رہنے کا نام لوگوں کے نزدیک ناکامی۔ یہی وہ چیز ہے جس کے پیچھے سارا انسانی قافلہ بھاگا چلا جا رہا ہے۔ کسی کو بھی آنے والے دن کی فکر نہیں۔ ہر شخص بس آج کے پیچھے دیوانہ ہو رہا ہے۔

صرف بڑے بڑے شہروں کا یہ حال نہیں ہے بلکہ جہاں بھی چند انسان بستے ہیں اور کچھ چلتے پھرتے لوگ موجود ہیں۔ ان سب کا یہی حال ہے۔ آپ کسی کو دیکھئے وہ اسی خیال میں ڈوبا ہوا نظر آئے گا۔ مرد ہو یا عورت، امیر ہو یا غریب، بوڑھا ہو یا جوان، جاہل ہو یا عالم، شہری ہو یا دیہاتی حتیٰ کہ مذہبی ہو یا غیر مذہبی سب کے سب اسی سمت میں بھاگے چلے جا رہے ہیں۔ آج آدمی کی سب سے بڑی تمنا صرف یہ ہے کہ دنیا میں وہ جتنا کچھ حاصل کرسکتا ہے حاصل کرلے، اسی کو وہ اپنے لئے "کام" سمجھتا ہے۔ اسی کے لئے اپنے بہترین اوقات اور بہترین صلاحیتوں کو صرف کرتا ہے۔ اسی کی فکر میں رات دن مشغول ہے۔ حد یہ ہے کہ اگر ضمیر اور ایمان کو قربان کرکے یہ چیز ملے تو وہ اپنا ضمیر اور ایمان بھی اس دیوی کی نذر کرنے کے لئے تیار ہے۔ وہ دنیا کو حاصل کرنا چاہتا ہے خواہ وہ جس طرح بھی ملے۔

مگر اس طرح کی ہر کامیابی صرف دنیا کی کامیابی ہے۔ آخرت میں وہ بالکل کام نہیں دے سکتی۔ جو شخص صرف آج کی دنیا بنانے کی فکر میں ہے اور آخرت کی طرف سے غافل ہے۔ اس کی مثال اس شخص

کی سی ہے جو اپنی جوانی میں اپنے بڑھاپے کے لئے جمع نہیں کرتا۔ یہاں تک کہ جب اس کی قوتیں جواب دے دیتی ہیں اور وہ کام کرنے سے معذور ہو جاتا ہے۔ تو اس کو معلوم ہوتا ہے کہ اب اس کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ میرے پاس مکان نہیں ہے مگر اب وہ اپنا مکان نہیں بنا سکتا۔ وہ دیکھتا ہے کہ اس کے پاس موسموں سے بچنے کے لئے کپڑا اور بستر نہیں ہے مگر اب اس میں اتنی سکت نہیں ہے کہ وہ اپنے لئے کپڑا اور بستر مہیا کر سکے۔ وہ دیکھتا ہے کہ اس کے کھانے کا کوئی انتظام نہیں ہے مگر اب وہ اپنے کھانے کے لئے کچھ نہیں کر سکتا۔ وہ حسرت کے ساتھ کسی دیوار کے سایہ میں چیتھڑا لپیٹے ہوئے پڑا رہتا ہے جس پر کتے بھونکتے ہیں۔ اور لڑکے کنکر مارتے ہیں۔

ہم اپنی آنکھوں سے اس طرح کی مثالیں دیکھتے ہیں جس سے ایک ہلکا اندازہ ہو سکتا ہے کہ آخرت کی کمائی نہ کرنے والے کے لئے آخرت کی زندگی کیسی ہوگی۔ مگر اس کے باوجود ہمارے اندر کوئی کھلبلی پیدا نہیں ہوتی۔ ہم میں کا ہر شخص صرف اپنے آج کی تعمیر میں مصروف ہے وہ اپنے کل کی کوئی فکر نہیں کرتا۔

جنگ کے زمانہ میں جب ہوائی حملے کا سائرن بجتا ہے اور اپنی مہیب آواز سے یہ اعلان کرتا ہے کہ "دشمن کے ہوائی جہاز آتشیں بموں کو لئے ہوئے غول در غول چلے آرہے ہیں اور تھوڑی دیر میں شہر کو آگ اور دھوئیں سے بھر دیں گے، لوگ فوراً پناہ گاہوں میں چلے جائیں" تو یکایک ہر شخص قریب کی پناہ گاہ کے راستے پر چل پڑتا ہے اور دم بھر میں انتہائی آباد سڑکیں بالکل سنسان ہو جاتی ہیں۔ جو شخص ایسا نہ کرے اس کے متعلق کہا جائے گا کہ وہ احمق ہے یا اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔

یہ دنیا کے چھوٹے خطرے کا معاملہ ہے۔ دوسرا ایک اس سے بڑا اور اس سے زیادہ یقینی خطرہ ہے جس کے متعلق کائنات کے مالک کی طرف سے خبردار کیا گیا ہے۔ خدا نے اپنے رسولوں کے ذریعہ اعلان کیا ہے کہ "لوگو میری عبادت کرو، ایک دوسرے کے حقوق پورے کرو اور میری مرضی کے مطابق زندگی گزارو۔ جو ایسا نہیں کرے گا میں اس کو ایسی سخت سزا دوں گا جس کا وہ تصور نہیں کر سکتا۔ یہ ایک مستقل عذاب ہوگا جس میں وہ ہمیشہ تڑپتا رہے گا اور کبھی اس سے نکل نہ سکے گا" اس اعلان کو ہر کان نے سنا ہے اور ہر زبان کسی نہ کسی شکل میں اس کا اقرار کرتی ہے۔ مگر لوگوں کا حال دیکھئے تو ایسا معلوم ہو گا جیسے یہ کوئی بات ہی نہیں ہے۔ دنیا کے فوائد حاصل کرنے کے لئے لوگ وہ سب کچھ کر رہے ہیں جو انھیں نہیں کرنا چاہئے۔ زندگی کا قافلہ نہایت تیزی سے اس راستے پر بھاگا جا رہا ہے جدھر جانے سے اس کو منع کیا گیا ہے۔ فوجی ہیڈ کوارٹر سے جو سائرن بجتا ہے اس پر عمل کرنے کے لئے فوراً لوگ دوڑ

پڑتے ہیں اور مالک کائنات کی طرف سے جس خطرے کا اعلان کیا گیا ہے اس سے کسی کو پریشانی لاحق نہیں ہوتی۔ لوگ اس کی پکار پر نہیں دوڑتے۔

اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ فوجی ہیڈ کوارٹر کا سائرن جس خطرے کا اعلان کرتا ہے اس کا تعلق آج کی دنیا سے ہے جس کو آدمی اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے اور اس کے نتیجے کو فوراً محسوس کر لیتا ہے۔ مگر خدا کی طرف سے جس خطرے کا اعلان کیا گیا ہے وہ مرنے کے بعد پیش آئے گا۔ ہمارے اور اس کے درمیان موت کی دیوار حائل ہے۔ وہ آج کی آنکھوں سے ہمیں نظر نہیں آتا۔ ہم نہ اس کے ہوائی جہازوں کو دیکھتے ہیں نہ اس کے بموں کو اور نہ اس کی آگ اور دھوئیں کی بارش کو۔ اس لئے ہوائی حملے کے سائرن کا تو لوگ فوراً یقین کر لیتے ہیں مگر خدا نے جس عذاب کی خبر دی ہے اس کو سن کر ان کے اندر کوئی سراسیمگی پیدا نہیں ہوتی۔ اس کے بارے میں وہ یقین پیدا نہیں ہوتا جو لوگوں کو عمل کے لئے بیتاب کر دے۔

مگر اللہ تعالیٰ نے ہم کو صرف وہی دو آنکھیں نہیں دی ہیں جو پیشانی کے نیچے نظر آتی ہیں اور سامنے کی چیزوں کو دیکھ لیتی ہیں۔ ہمارے پاس ایک اور آنکھ ہے جو زیادہ دور تک دیکھ سکتی ہے۔ جو چھپی ہوئی حقیقتوں کو بھی دیکھتی ہے۔ یہ آنکھ عقل کی آنکھ ہے۔ لوگوں کی بے یقینی کی وجہ یہی ہے کہ وہ اپنی اس دوسری آنکھ کو استعمال نہیں کرتے۔ وہ سامنے جو کچھ دیکھتے ہیں، سمجھتے ہیں کہ بس یہی حقیقت ہے۔ حالانکہ اگر غور و فکر سے کام لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ جو چیز ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ اس سے زیادہ یقینی ہے وہ چیز جو ہماری آنکھوں کے سامنے نہیں ہے۔

اگر یہ سوال کیا جائے کہ اس کائنات میں وہ کون سی حقیقت ہے جس کو ہر شخص مانتا ہو تو اس کا ایک ہی جواب ہوگا۔ یعنی موت۔ موت ایک ایسی حقیقت ہے جو ہر بڑے چھوٹے کو تسلیم کرنی پڑتی ہے۔ ہم میں سے ہر شخص جانتا ہے کہ کسی بھی وقت اس کی موت آ سکتی ہے مگر جب موت کا خیال آتا ہے تو عام طور پر لوگ صرف اتنا سوچتے ہیں کہ "میرے مرنے کے بعد میرے بچوں کا کیا ہوگا" مرنے سے پہلے تو وہ اپنی زندگی کے بارے بہت سوچتے ہیں مگر مرنے کے بعد انھیں صرف گھر اور بچوں کی فکر ہوتی ہے۔ بچوں کا مستقبل محفوظ کرنے کے لئے تو وہ ساری عمر لگا دیتے ہیں مگر جو مستقبل خود ان کے سامنے آنے والا ہے اس کی تعمیر کے لئے کوئی کوشش نہیں کرتے۔ گویا ان کے مرنے کے بعد صرف ان کے بچوں کا وجود باقی رہے گا، خود ان کا کوئی وجود نہیں ہوگا جس کے لئے انھیں تیاری کرنے کی ضرورت ہو۔

اس انداز میں لوگوں کا سوچنا یہ بتاتا ہے کہ انھیں شاید اس کا احساس نہیں ہے کہ مرنے کے

بعد بھی ایک زندگی ہے بلکہ اصل زندگی مرنے کے بعد ہی شروع ہوتی ہے۔ اگر انھیں اس بات کا یقین ہوتا کہ مرکر جب وہ قبر میں دفن ہوتے ہیں تو درحقیقت وہ قبر میں دفن نہیں ہوتے بلکہ ایک دوسری دنیا میں داخل کر دیئے جاتے ہیں۔ تو وہ بچوں کے مستقبل کے بارے میں سوچنے سے پہلے یہ سوچتے کہ "مرنے کے بعد میرا کیا انجام ہوگا"۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دنیا کا بیشتر انسان خواہ وہ مذہبی ہو یا غیر مذہبی اس یقین سے خالی ہوگیا ہے کہ وہ مرنے کے بعد ختم نہیں ہوجاتا بلکہ نئی زندگی حاصل کرتا ہے۔ ایک ایسی زندگی جو موجودہ زندگی سے زیادہ حقیقی ہے، جو موجودہ زندگی سے زیادہ اہم ہے۔

موت کے بعد آنے والی زندگی کے بارے میں شبہہ دو وجہوں سے پیدا ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ ہر انسان مرکر مٹی میں مل جاتا ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ انسان مرکر ختم ہوگیا تو ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ دوبارہ کس طرح زندگی پائے گا۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ موت کے بعد جو دنیا ہے وہ ہم کو نظر نہیں آتی۔ آج کی دنیا کو تو ہر شخص اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے مگر اس کے بعد والی دنیا کو اب تک کسی نے نہیں دیکھا۔ اس لیے ہم کو یقین نہیں آتا کہ اس زندگی کے بعد بھی کوئی زندگی ہوسکتی ہے۔ آیئے ان دونوں سوالوں پر غور کریں۔

موت کے بعد زندگی

"جب میں مرکر مٹی ہوجاؤں گا تو کیا مجھے دوبارہ اٹھایا جائے گا"، اس سوال کو اس طرح متعین کرکے تو بہت کم لوگ سوچتے ہیں مگر ہر وہ شخص جو اس بات پر گہرا یقین نہیں رکھتا کہ مرنے کے بعد اسے ایک نئی زندگی سے سابقہ پیش آنے والا ہے اس کے ذہن میں ضرور یہ سوال دبا ہوا رہتا ہے۔ جو شخص آج کی زندگی میں کل کی زندگی کے لئے فکرمند نہیں ہے وہ اس بات کا ثبوت پیش کررہا ہے کہ وہ کل کی زندگی کے متعلق شبہہ میں مبتلا ہے۔ خواہ وہ باقاعدہ اس مسئلے پر سوچتا ہو یا نہ سوچتا ہو۔

لیکن اگر ہم سنجیدگی سے غور کریں تو نہایت آسانی سے اس کی حقیقت سمجھ سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اگرچہ موت کے بعد پیش آنے والی حقیقتوں کو ہماری نگاہوں سے چھپا دیا ہے کیوں کہ وہ ہمارا امتحان لے رہا ہے، مگر کائنات میں ایسی بے شمار نشانیاں پھیلادی ہیں جن پر غور کرکے ہم تمام حقیقتوں کو سمجھ سکتے ہیں۔ یہ کائنات ایک آئینہ ہے جس میں دوسری دنیا کا عکس نظر آتا ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ ہم اپنی موجودہ شکل میں اول روز سے موجود نہیں ہیں۔ انسان کی ابتدا ایک بے شکل حقیر مادے سے ہوتی ہے جو ماں کے پیٹ میں بڑھ کر انسانی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ اور پھر باہر آکر مزید ترقی کرکے پورا انسان بن جاتا ہے۔ ایک بے شعور اور حقیر مادہ جو اتنا چھوٹا ہوتا

ہے کہ خالی آنکھ سے دیکھا نہیں جا سکتا اس کا بڑھ کر چھ فٹ لمبا انسان بن جانا ایک ایسا واقعہ ہے جو روزانہ اس دنیا میں پیش آتا ہے۔ پھر یہ سمجھنے میں آپ کو کیا دقت پیش آتی ہے کہ ہمارے جسم کے اجزا جو نہایت چھوٹے چھوٹے ذرات بن کر زمین میں منتشر ہو جائیں گے تو دوبارہ وہ پورے انسان کی شکل اختیار کر سکتے ہیں۔

ہر انسان جس کو آپ چلتا پھرتا دیکھتے ہیں وہ دراصل انسان کی شکل میں بے شمار ایٹم ہیں جو پہلے ہماری زمین اور ہماری فضا کے اندر نامعلوم وسعتوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ پھر ہوا، اور پانی اور خوراک نے ان ایٹموں کو لا کر ایک انسانی وجود میں اکٹھا کر دیا اور اب ہم انھیں منتشر ایٹموں کے مجموعے کو ایک چلتے پھرتے انسان کی شکل میں دیکھ رہے ہیں۔ یہی عمل دوبارہ ہوگا۔ ہمارے مرنے کے بعد ہماری زندگی کے اجزا ہوا اور پانی اور زمین میں منتشر ہو جائیں گے اور اس کے بعد جب خدا کا حکم ہوگا تو وہ اسی طرح اکٹھا ہو کر ایک وجود کی شکل میں مجسّم ہو جائیں گے جس طرح وہ پہلی بار مُجسّم ہوئے تھے۔ ایک واقعہ جو ہو چکا ہے وہی اگر دوبارہ ظہور میں آئے تو اس میں تعجب کی کون سی بات ہے۔

خود مادّی دنیا میں ایسی مثالیں موجود ہیں جو اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ زندگی کو دوسری بار دہرایا جا سکتا ہے۔ ہر سال برسات میں ہم دیکھتے ہیں کہ زمین میں سبزہ اگتا ہے اور ہر طرف ہریالی پھیل جاتی ہے پھر گرمی کا زمانہ اس کے لئے موت کا پیغام بن کر آتا ہے اور ساری زمین خشک ہو جاتی ہے۔ جہاں سبزہ لہلہا رہا تھا وہاں چٹیل میدان دکھائی دینے لگتا ہے۔ اس طرح ایک زندگی پیدا ہو کر مر جاتی ہے۔ لیکن اگلی بار جب برسات کا موسم آتا ہے اور آسمان سے بارش ہوتی ہے تو وہی مرے ہوئے سبزے دوبارہ جی اٹھتے ہیں اور خشک زمین پھر سبزہ زار نظر آنے لگتی ہے۔ اسی طرح انسان بھی مرنے کے بعد زندہ کیے جائیں گے۔

ایک اور پہلو سے دیکھئے۔ زندگی بعد موت کے بارے میں شبہہ اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ ہم اپنا تصور موجودہ جسمانی وجود کی شکل میں کرتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ خارج میں جو ایک چلتا پھرتا جسم دکھائی دیتا ہے، یہی اصل انسان ہے اور جب یہ سڑ گل جائے گا اور اس کے اجزا مٹی میں مل چکے ہوں گے تو اس کو دوبارہ کس طرح مجسم کر کے کھڑا کیا جا سکتا ہے۔ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ ایک زندہ انسان کی موت آتی ہے، وہ خاموش ہو جاتا ہے، اس کی حرکت رک جاتی ہے۔ اس کی تمام صلاحیتیں ختم ہو جاتی ہیں۔ اس کے بعد وہ زمین کے نیچے دبا دیا جاتا ہے یا بعض قوموں

کے رواج کے مطابق جلا کر دریا میں بہا دیا جاتا ہے۔ کچھ دنوں کے بعد وہ ریزے ریزے ہو کر اس طرح منتشر ہو جاتا ہے کہ پھر اس کا کوئی وجود ہمیں نظر نہیں آتا۔ ایک زندہ انسان کو اس طرح ختم ہوتے ہوئے ہم روزانہ دیکھتے ہیں۔ پھر ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ انسان جو ختم ہو چکا ہے وہ دوبارہ کیسے موجود ہو جائے گا۔

مگر ہمارا اصل وجود ہمارا یہ جسم نہیں ہے جس کو ہم بظاہر چلتا پھرتا ہوا دیکھتے ہیں۔ بلکہ اصل وجود وہ اندرونی انسان ہے جو آنکھوں سے نظر نہیں آتا۔ جو سوچتا ہے، جو جسم کو متحرک رکھتا ہے جس کی موجودگی جسم کو زندہ رکھتی ہے اور جس کے نکل جانے کے بعد جسم تو باقی رہتا ہے مگر اس میں کسی قسم کی زندگی نہیں پائی جاتی۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان کسی مخصوص جسم کا نام نہیں ہے بلکہ اس روح کا نام ہے جو جسم کے اندر موجود ہوتی ہے۔ جسم کے متعلق ہم کو معلوم ہے کہ یہ بہت سے انتہائی چھوٹے چھوٹے ریزوں سے مل کر بنا ہے جس کو زندہ خلیہ (Living cell) کہتے ہیں۔ ہمارے جسم میں خلیوں کی وہی حیثیت ہے جو کسی مکان میں اس کی اینٹوں کی ہوتی ہے۔ ہمارے جسمانی مکان کی یہ اینٹیں یا اصطلاحی زبان میں خلیے ہماری حرکت اور عمل کے دوران برابر ٹوٹتے رہتے ہیں جس کی کمی ہم غذا کے ذریعے پوری کرتے ہیں۔ غذا ہضم ہو کر ہی مختلف قسم کے خلیے بناتی ہے جو جسم کی ٹوٹ پھوٹ کو مکمل کر دیتے ہیں۔ اس طرح انسان کا جسم مسلسل گھِستا اور بدلتا رہتا ہے۔ پچھلے خلیے ٹوٹتے ہیں اور نئے خلیے ان کی جگہ لے لیتے ہیں۔ یہ عمل ہر روز ہوتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ کچھ عرصے کے بعد سارے کا سارا جسم بالکل نیا ہو جاتا ہے۔

یہ عمل اوسطاً دس سال میں مکمل ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں آپ کا جسم جو دس سال پہلے تھا۔ اس میں آج کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ آج آپ کا جسم ایک نیا جسم ہے۔ دس سال کے عرصے میں آپ کے جسم کے جو حصے ٹوٹ کر الگ ہوئے ہیں۔ اگر ان کو پوری طرح یکجا کیا جا سکے تو بعینہٖ آپ کی شکل کا ایک دوسرا انسان کھڑا کیا جا سکتا ہے حتیٰ کہ اگر آپ کی عمر سو سال ہو تو آپ ہی جیسے تقریباً دس انسان بنائے جا سکتے ہیں۔ یہ انسان بظاہر دیکھنے میں آپ کی طرح ہوں گے۔ مگر وہ سب کے سب مردہ جسم ہوں گے جن کے اندر آپ موجود نہیں ہوں گے۔ کیوں کہ آپ نے پچھلے جسموں کو چھوڑ کر ایک نئے جسم کو اپنا قالب بنا لیا ہے۔

اس طرح آپ کا جسم بنتا بگڑتا رہتا ہے مگر آپ کے اندر کوئی تبدیلی نہیں ہوتی جس

چیز کو آپ "میں" کہتے ہیں وہ بدستور باقی ہے۔ آپ نے اگر کسی سے دس سال پہلے معاہدہ کیا تھا تو آپ ہر وقت تسلیم کرتے ہیں کہ یہ معاہدہ "میں" نے کیا تھا۔ حالانکہ اب آپ کا پچھلا جسمانی وجود باقی نہیں ہے۔ وہ ہاتھ اب آپ کے جسم پر نہیں ہے جس نے معاہدے کے کاغذات پر دستخط کئے تھے اور نہ وہ زبان موجود ہے جس نے معاہدے کی بابت گفتگو کی تھی۔ لیکن "آپ" اب بھی موجود ہیں اور تسلیم کرتے ہیں کہ دس سال پہلے جو معاہدہ میں نے کیا تھا وہ میرا ہی معاہدہ تھا اور اب بھی میں اس کا پابند ہوں۔ یہی وہ اندرونی انسان ہے جو جسم کے ساتھ بدلتا نہیں بلکہ جسم کی کتنی ہی تبدیلیوں کے باوجود اپنے آپ کو باقی رکھتا ہے۔

اس سے ثابت ہوا کہ انسان کسی خاص جسم کا نام نہیں ہے جس کے مرنے سے انسان بھی مر جائے۔ بلکہ وہ ایک ایسی روح ہے جو جسم سے الگ اپنا وجود رکھتی ہے اور جسم کے اجزاء منتشر ہونے کے بعد بھی بدستور باقی رہتی ہے۔ جسم کے بدلنے اور روح کے نہ بدلنے میں اس حقیقت کا صاف اشارہ موجود ہے کہ جسم فانی ہے مگر روح فانی نہیں۔

بعض نادان لوگ یہ کہتے ہیں کہ زندگی اور موت نام ہے کچھ مادی اجزاء کے اکٹھے ہونے اور پھر منتشر ہو جانے کا۔ ان اجزاء کے ملنے سے زندگی بنتی ہے اور ان کے الگ ہو جانے سے موت واقع ہوتی ہے۔ اسی نظریے کو چکبست نے ان لفظوں میں ادا کیا ہے:

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے انھیں اجزاء کا پریشاں ہونا

مگر یہ ایک ایسی بات ہے جس کا علم سے کوئی تعلق نہیں۔ اگر زندگی محض "عناصر میں ظہور ترتیب" کا نام ہے تو اس کو اس وقت تک باقی رہنا چاہئے جب تک عناصر کی یہ ترتیب موجود ہے اور یہ بھی ممکن ہونا چاہئے کہ کوئی ہوشیار سائنس داں ان عناصر کو یکجا کر کے زندگی پیدا کر سکے۔ مگر ہم جانتے ہیں کہ یہ دونوں باتیں ناممکن ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ مرنے والوں میں صرف وہی نہیں ہیں جن کو کوئی ایسا حادثہ پیش آئے جو ان کے جسم کے ٹکڑے کر دے۔ بلکہ ہر حالت میں اور ہر عمر کے لوگ مرتے ہیں۔ بعض مرتبہ اچھے خاصے تندرست انسان کے دل کی حرکت یکایک اس طرح بند ہو جاتی ہے کہ کوئی ڈاکٹر بتا نہیں پاتا کہ ایسا کیوں ہوا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مرنے والے کا جسم اپنی سابقہ حالت میں لیٹا ہوا ہے۔ دوسرے لفظوں میں "عناصر کا ترتیبی ظہور" مکمل طور پر موجود ہے۔ مگر اس کے اندر جو روح تھی وہ

نکل چکی ہے۔ سارے عناصر اسی خاص ترتیب کے ساتھ اب بھی موجود ہوتے ہیں جو اب سے چند منٹ پہلے تھے مگر اس کے اندر زندگی موجود نہیں ہوتی۔ یہ واقعہ ظاہر کرتا ہے کہ مادی عناصر کی ترتیب زندگی پیدا نہیں کرتی بلکہ زندگی اس سے الگ ایک چیز ہے جو اپنا مستقل وجود رکھتی ہے۔

کسی لیبارٹری میں زندہ انسان نہیں بنایا جا سکتا اگرچہ جسم کی شکل ہر وقت بنائی جا سکتی ہے۔ یہ معلوم ہو چکا ہے کہ زندہ جسم کے اجزا ء بالکل معمولی کیمیاوی ایٹم ہوتے ہیں۔ اس میں کاربن وہی ہے جو ہم کالک میں دیکھتے ہیں۔ ہائیڈروجن اور آکسیجن وہی ہے جو پانی کی اصل ہے۔ نائٹروجن وہی ہے جس سے کرۂ ہوا کا بیشتر حصہ بنا ہے۔ اور اسی طرح دوسری چیزیں۔ مگر کیا ایک زندہ انسان محض معمولی ایٹموں کا ایک خاص مجموعہ ہے جو کسی غیر معمولی طریقے سے ترتیب دے دیا گیا ہے۔ یا وہ اس کے علاوہ کچھ اور ہے۔ سائنس داں کہتے ہیں کہ اگرچہ ہم یہ جانتے ہیں کہ انسان کا جسم فلاں فلاں مادی اجزاء سے مل کر بنا ہے مگر انھیں اجزاء کو یکجا کر کے ہم زندگی پیدا نہیں کر سکتے۔ دوسرے لفظوں میں ایک زندہ انسان کا جسم محض بے جان ایٹموں کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ وہ ایٹم اور زندگی دونوں ہے۔ مرنے کے بعد ایٹموں کا مجموعہ تو ہمارے سامنے موجود رہتا ہے مگر زندگی اس سے رخصت ہو کر دوسری دنیا میں چلی جاتی ہے۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ زندگی مٹنے والی چیز نہیں ہے۔ بلکہ باقی رہنے والی چیز ہے۔ اب ہم سمجھ سکتے ہیں کہ زندگی بعد موت کا نظریہ کس قدر عقلی اور فطری نظریہ ہے۔ یہ حقیقت پکار رہی ہے کہ زندگی صرف وہی نہیں ہو سکتی جو موت سے پہلے نظر آتی ہے بلکہ مرنے کے بعد بھی ہمیں زندہ رہنا چاہئے۔ ہماری عقل تسلیم کرتی ہے کہ یہ دنیا اور اس کی عمر فانی ہے مگر انسان ایک ایسا وجود ہے جو اس کے بعد بھی باقی رہتا ہے۔ جب ہم مرتے ہیں تو درحقیقت ہم مرتے نہیں بلکہ زندہ رہنے کے لئے دوسری دنیا میں چلے جاتے ہیں۔ موجودہ زندگی ہماری مسلسل عمر کا محض ایک مختصر وقفہ ہے۔

دوسری دنیا

اب اس سوال پر غور کیجئے کہ دوسری زندگی کیسی ہوگی۔ خدا کے رسول کہتے ہیں کہ وہاں جنت اور دوزخ ہے۔ ہر شخص جو مرتا ہے وہ ان دو میں سے کسی ایک کے اندر داخل کیا جاتا ہے۔ جو شخص آج کی دنیا میں خدا کا فرمانبردار ہوگا اور نیک عمل کرے گا اس کو جنت کی آرام گاہ میں جگہ ملے گی۔ اور جو بدکردار اور خدا کا نافرمان ہوگا اس کو جہنم کی تکلیفوں میں ڈالا جائے گا۔

اس کو سمجھنے کے لئے اس حقیقت پر غور کیجئے کہ انسان جو کام بھی کرتا ہے اس کی دو حیثیتیں ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ ایک واقعہ ہے جیسے کہ بہت سے واقعات ہوتے ہیں۔ اور دوسرے یہ کہ وہ خاص

ارادے کے تحت کیا گیا ہے۔ پہلی حیثیت کو ہم واقعاتی کہہ سکتے ہیں اور دوسری کو اخلاقی۔ ایک مثال سے اس کی مزید وضاحت ہو جائے گی۔

اگر کسی درخت پر کوئی پتھر اٹکا ہوا ہو، آپ اس کے نیچے سے گزریں اور یکایک پتھر آپ کے اوپر گر پڑے اور آپ کا سر ٹوٹ جائے تو آپ درخت سے لڑائی نہیں کریں گے نہ اس پر خفا ہوں گے بلکہ خاموشی سے اپنا سر پکڑے ہوئے گھر چلے جائیں گے۔ اس کے برعکس اگر کوئی آدمی جان بوجھ کر آپ کے اوپر ایک پتھر کھینچ مارے جس سے آپ کا چہرہ زخمی ہو جائے تو آپ اس پر برس پڑتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اس کا سر توڑ ڈالیں جس طرح اس نے آپ کا سر توڑا ہے۔

درخت اور انسان میں یہ فرق کیوں ہے۔ کیوں آپ درخت سے بدلہ نہیں لیتے اور انسان سے بدلہ لینا چاہتے ہیں، اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ درخت اس احساس و شعور سے خالی ہے جو انسان کو حاصل ہے۔ درخت کا عمل صرف واقعاتی نوعیت رکھتا ہے جب کہ انسان کا عمل واقعاتی اور اخلاقی دونوں ہے۔

اس سے ظاہر ہوا کہ انسان کے عمل کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک یہ کہ اس کی وجہ سے کوئی واقعہ دنیا میں ظاہر ہوا۔ دوسرے یہ کہ وہ عمل جائز تھا یا ناجائز۔ صحیح جذبے سے کیا گیا تھا یا غلط جذبے سے۔ اس کو ہونا چاہئے تھا یا نہیں ہونا چاہئے تھا۔ جہاں تک عمل کی پہلی حیثیت کا تعلق ہے اس کا پورا انجام اسی دنیا میں ظاہر ہو جاتا ہے۔ مگر اس کی دوسری حیثیت کا انجام اس دنیا میں ظاہر نہیں ہوتا۔ اور کبھی ظاہر ہوتا ہے تو نہایت ناقص شکل میں۔ جس شخص نے آپ کو پتھر مارا اس کے عمل کا یہ انجام تو فوراً ظاہر ہو گیا کہ آپ کا سر ٹوٹ گیا مگر اس کے عمل کا دوسرا انجام کہ اس نے اپنی قوتوں کا غلط استعمال کیا اس کا انجام ظاہر ہونا ضروری نہیں ہے۔ اس نے چاہا تھا کہ سر توڑے اور سر ٹوٹ گیا۔ اس نے چاہا تھا کہ ایک غلط کام کرے مگر اس کے اس دوسرے ارادے کا کوئی نتیجہ ہمارے سامنے نہیں آیا۔ نتیجہ نام ہے انسانی ارادے کے خارجی ظہور کا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ انسانی ارادے کا ایک نتیجہ (واقعاتی نتیجہ) ہمیشہ ظاہر ہو جاتا ہے۔ پھر انسانی ارادے کا دوسرا نتیجہ۔ اخلاقی نتیجہ۔ بھی ضرور ظاہر ہونا چاہئے۔

آخرت انسانی عمل کے اسی دوسرے پہلو کا مکمل انجام ظاہر ہونے کی جگہ ہے۔ جس طرح آدمی کے عمل کا ایک پہلو کچھ واقعات کو ظہور میں لاتا ہے۔ اسی طرح اس کے عمل کا دوسرا پہلو کچھ دوسرے واقعات کو پیدا کرتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ پہلی قسم کے واقعات کو ہم اسی دنیا میں اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے ہیں اور دوسری قسم کے واقعات کو ہم مرنے کے بعد دیکھیں گے۔

ہر آدمی جو دنیا میں زندگی گزار رہا ہے وہ اپنے عمل سے اپنے لئے کوئی نہ کوئی نتیجہ پیدا

کرنے میں مصروف ہے۔ خواہ وہ بیکار بیٹھا ہو یا کسی کام میں مشغول ہو، اس کی ہر حالت اس کے موافق یا مخالف ایک ردّعمل پیدا کرتی ہے۔ اس کے عادات واخلاق سے لوگ اس کے بارے میں رائے قائم کرتے ہیں۔ وہ اپنی قوتوں کو جس طرح استعمال کرتا ہے اسی کے لحاظ سے اس کے کام بنتے یا بگڑتے ہیں، وہ اپنی کوششوں کو جس چیز میں لگاتا ہے اس نوعیت کی چیزوں پر اس کا حق قائم ہوتا ہے۔

غرض ہر شخص اپنے گردوپیش اپنی ایک دنیا کی تخلیق کر رہا ہے جو عین اس کے عمل کے مطابق ہے۔ یہ آدمی کے عمل کا ایک پہلو ہے جو موجودہ دنیا سے متعلق ہے۔ اسی طرح اس کے کام کی دوسری حیثیت، صحیح یا غلط ہونے کی حیثیت بھی اپنا ایک انجام پیدا کرتی ہے جو دوسری دنیا میں ذخیرہ ہو رہا ہے۔ ہمارے عمل کا اخلاقی پہلو مستقل طور پر اپنے انجام کی تخلیق کر رہا ہے اور اسی کا نام مذہب کی اصطلاح میں جنت اور دوزخ ہے۔ ہم میں سے ہر شخص ہر آن اپنے لئے جنت یا دوزخ تعمیر کر رہا ہے۔ چوں کہ اس دنیا میں آدمی کو امتحان کی غرض سے ٹھہرایا گیا ہے اس لئے جنت اور دوزخ اس کی نگاہوں سے اوجھل رکھی گئی ہے۔ جب امتحان کی مدّت ختم ہوگی اور قیامت آئے گی تو ہر شخص اپنی تعمیر کی ہوئی دنیا میں پہنچا دیا جائے گا۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ اگر ہمارے عمل کا کوئی اخلاقی انجام ہے تو وہ ہم کو نظر کیوں نہیں آتا۔ مثلاً مکان بنانا ایک عمل ہے جس کا انجام یہ ہے کہ مکان بن کر کھڑا ہو جائے۔ یہ انجام ظاہر ہوتا ہے اور اس کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ مگر اس عمل کا یہ پہلو کہ وہ جائز طریقے پر بنایا گیا ہے یا ناجائز طریقے پر، یہ بھی اگر کوئی انجام پیدا کرتا ہے تو وہ کہاں ہے۔ کیا ایسا بھی کوئی انجام ہو سکتا ہے جس کو دیکھا اور چھوا نہ جا سکتا ہو۔

اس کا جواب خود عمل کی ان دونوں حیثیتوں میں موجود ہے۔ کسی عمل کی جو واقعاتی حیثیت ہے اس کو ہر شخص دیکھتا ہے حتیٰ کہ کیمرے کی بے جان آنکھ بھی اس کو صاف طور پر دیکھ لیتی ہے۔ مگر کسی عمل کی اخلاقی حیثیت نظر آنے والی چیز نہیں ہے۔ وہ صرف محسوس ہوتی ہے دیکھی نہیں جاتی۔ عمل کی دونوں حیثیتوں کا یہ فرق خود اشارہ کر رہا ہے کہ دونوں قسم کا انجام کس طرح ظاہر ہونا چاہئے۔ یہ اس بات کا صریح اشارہ ہے کہ عمل کی پہلی حیثیت کا انجام اسی دنیا میں نظر آنا چاہیئے جس کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اور عمل کی دوسری حیثیت کا انجام اُس دنیا میں نظر آئے گا جو ابھی ہماری آنکھوں سے اوجھل ہے۔ گویا جو کچھ ہے، یہی دراصل ہونا بھی چاہئے تھا۔

مگر یہ صرف عقلی امکان ہی کی بات نہیں ہے۔ کائنات کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ بالفعل یہاں دونوں قسم کے انجام پائے جاتے ہیں۔ ایسے بھی جنھیں ہم واقع ہونے کے بعد فوراً دیکھ لیں اور ایسے بھی جو اگرچہ ہماری آنکھوں کو نظر نہیں آتے مگر وہ ایک حقیقت کے طور پر موجود ہوتے ہیں۔ کائنات میں ایسے غیر مرئی نتائج کا موجود ہونا صریح طور پر ظاہر کرتا ہے کہ اسی قسم کے دوسرے غیر مرئی نتائج بھی موجود ہو سکتے ہیں۔ کائنات کی تخلیق اپنے اندر ایسے نتائج کے ہونے کا اقرار کرتی ہے۔

مثال کے طور پر آواز کو لیجئے۔ آپ جانتے ہیں کہ آواز نام ہے ایسی لہروں کا جن کو آنکھ کے ذریعہ دیکھا نہیں جا سکتا۔ جب ہم بولنے کے لئے زبان کو حرکت دیتے ہیں تو اس کی حرکت سے ہوا میں کچھ لہریں پیدا ہوتی ہیں۔ انھیں لہروں کو ہم آواز کہتے ہیں۔ آواز ایک طرح کا غیر مرئی نقش ہے جو ہماری زبان کے ہلنے سے ہوا میں پیدا ہوتا ہے۔ جب بھی کوئی شخص بولتا ہے تو اس کی آواز لہروں کی شکل میں نقش ہو جاتی ہے۔ اور مستقل طور پر باقی رہتی ہے۔ حتیٰ کہ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ اب سے ہزاروں برس پہلے کسی انسان نے جو آواز اپنے منھ سے نکالی تھی، جو گفتگو یا تقریر کی تھی سب کی سب ہوا کے اندر لہروں کی شکل میں موجود ہے۔ اگرچہ آج ہم ان آوازوں کو نہیں دیکھتے اور نہ اسے سنتے ہیں۔ لیکن اگر ہمارے پاس ان کو گرفت کرنے والے آلات ہوں تو کسی بھی وقت ان کو بعینہٖ اپنی سابق شکل میں دہرایا جا سکتا ہے۔

اس مثال کے ذریعہ ہم دوسری دنیا کے مسئلے کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ جس طرح ہمارے چاروں طرف ہوا کا ایک غلاف ہے۔ اور ہماری ہر آواز منھ سے نکلتے ہی اس پر نقش ہو جاتی ہے۔ حالانکہ نہ ہم ہوا کو دیکھتے ہیں اور نہ اپنی آواز کے نقوش کو۔ ٹھیک اسی طرح وہ دوسری دنیا بھی ہم کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ اور ہماری نیتوں اور ارادوں کو مسلسل ریکارڈ کرتی جا رہی ہے۔ اس کے پردے پر ہمارے اعمال کے نقوش ثبت ہو رہے ہیں جو مرنے کے بعد ظاہر ہو جائیں گے۔ گراموفون میں چابی بھری ہوئی ہو اور ریکارڈ اس کے اوپر گھوم رہا ہو تو سوئی رکھتے ہی ریکارڈ کی خاموش تختی یکایک اس طرح بول پڑتی ہے۔ جیسے وہ اسی کی منتظر تھی کہ کوئی اس کے اوپر سوئی رکھے اور وہ اپنے اندر کی آواز نکالنا شروع کر دے۔ اسی طرح ہمارے تمام اعمال کا ریکارڈ تیار ہو رہا ہے اور جب کائنات کا مالک حکم دے گا تو سارا ریکارڈ اس طرح سامنے آجائے گا کہ اس کو دیکھ کر آدمی بے اختیار کہے گا مالھذا الکتاب لا یغادر صغیرۃ ولا کبیرۃ الا احصاھا۔ (الکہف ۴۹)
(یہ کیسی کتاب ہے۔ میرا چھوٹا بڑا کوئی عمل ایسا نہیں ہے جو اس نے محفوظ نہ کر لیا ہو)

آخری بات

اوپر میں نے جو کچھ بیان کیا ہے۔ اب آخر میں پھر ایک بار اس کو اپنے ذہن میں دہرا لیجئے۔ آپ کی زندگی ایک نہایت طویل اور مسلسل زندگی ہے۔ موت اس زندگی کی آخری حد نہیں ہے بلکہ وہ اس کے دوسرے دور کی ابتدا ہے۔ موت ہماری زندگی کے دو مرحلوں کے درمیان حدِّ فاصل قائم کرتی ہے۔ اس کو مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ کسان ایک فصل بوتا ہے، اس پر کوشش کرتا ہے۔ اپنا سرمایہ اس میں لگاتا ہے یہاں تک کہ فصل تیار ہو کر سوکھ جاتی ہے۔ اس وقت وہ اسے کاٹ لیتا ہے تاکہ اس سے غلّہ حاصل کر کے اپنی سال بھر کی خوراک کا انتظام کرے۔ فصل کا کٹنا فصل کے ایک دور کا ختم ہونا اور اس کے دوسرے دور کا آغاز ہونا ہے۔ اس سے پہلے بونا اور فصل کو تیار کرنا تھا۔ اس کے بعد اس کا پھل حاصل کرنا اور اس سے اپنی ضرورت پوری کرنا ہے۔ فصل کٹنے سے پہلے صرف کوشش اور خرچ تھا اور فصل کٹنے کے بعد صرف اپنی محنت کا نتیجہ پانا اور اس سے فائدہ اٹھانا ہے۔

ٹھیک یہی حال ہماری زندگی کا بھی ہے۔ ہم اس دنیا میں اپنی آخرت کی فصل تیار کر رہے ہیں۔ ہم میں سے ہر شخص آخرت میں اپنا ایک کھیت رکھتا ہے جس میں وہ یا تو کاشت کر رہا ہے یا اس کو خالی چھوڑے ہوئے ہے۔ اس نے یا تو خراب بیج استعمال کئے ہیں یا اچھے بیج ڈالے ہیں۔ اس نے بیج ڈال کر یا تو اسے چھوڑ دیا ہے یا وہ بیج ڈالنے کے بعد مسلسل اس کی نگرانی کر رہا ہے۔ اس نے یا تو کانٹوں کی فصل بوئی ہے یا پھل اور پھول اگائے ہیں۔ وہ یا تو اپنی ساری قوت اس کھیتی کو بہتر بنانے میں لگائے ہوئے ہے یا دوسرے غیر متعلق مشاغل اور دلچسپیوں میں بھی وہ اپنا وقت ضائع کر رہا ہے۔ اس فصل کی تیاری کی مدت اس وقت تک ہے جب تک ہم کو موت نہیں آجاتی۔ موت آخرت کی فصل کاٹنے کا دن ہے۔ جب اس دنیا میں ہماری آنکھ بند ہو گی تو دوسری دنیا میں ہماری آنکھ کھلے گی۔ وہاں ہماری عمر بھر کی تیار کی ہوئی کھیتی ہمارے سامنے موجود ہو گی۔

یاد رکھیے کاٹنے کے دن وہی کاٹتا ہے جس نے کاٹنے سے پہلے کھیتی کی ہو اور وہی چیز کاٹتا ہے جو اس نے اپنے کھیت میں بوئی تھی۔ اسی طرح آخرت میں ہر شخص کو وہی فصل ملے گی جو اس نے موت سے پہلے تیار کی ہے۔ ہر کسان جانتا ہے کہ اس کے گھر میں ٹھیک اتنا ہی غلّہ آئے گا جتنی اس نے محنت کی ہے اور وہی چیز آئے گی جو اس نے بوئی تھی۔ اسی طرح آخرت میں بھی آدمی کو اسی کے بقدر ملے گا جتنی اس نے جد وجہد کی ہے اور وہی کچھ ملے گا جس کے لئے اس نے کوشش کی ہو۔

موت کوشش کی مدت ختم ہونے کا آخری اعلان ہے اور آخرت اپنی کوششوں کا انجام پانے کی آخری جگہ۔ موت کے بعد نہ دوبارہ کوشش کرنے کا موقع ہے اور نہ آخرت کبھی ختم ہونے والی ہے۔ کتنا سنگین ہے یہ واقعہ۔ کاش انسان موت سے پہلے اس حقیقت کو سمجھ لے کیوں کہ موت کے بعد سمجھنا کچھ بھی کام نہ آئے گا۔ موت کے بعد ہوشیار ہونے کے معنی صرف یہ ہیں کہ آدمی اس بات پر افسوس کرے کہ اس نے ماضی میں کتنی بڑی غلطی کی ہے، ایک ایسی غلطی جس کی اب کوئی تلافی نہیں ہو سکتی۔

انسان اپنے انجام سے غافل ہے حالانکہ زمانہ اس کو نہایت تیزی سے اس وقت کی طرف لئے جا رہا ہے جب فصل کٹنے کا وقت آجائے گا۔ وہ دنیا کے حقیر فائدوں کو حاصل کرنے میں مصروف ہے اور سمجھتا ہے کہ میں کام کر رہا ہوں۔ حالانکہ دراصل وہ اپنے قیمتی اوقات کو ضائع کر رہا ہے۔ اس کے سامنے ایک عظیم موقع ہے جس کو استعمال کرکے وہ اپنے لئے ایک ناقابل قیاس حد تک شاندار مستقبل بنا سکتا ہے۔ مگر وہ کنکریوں سے کھیل رہا ہے۔ اس کا رب اس کو اپنی جنّت کی طرف بلا رہا ہے جو لامتناہی عزت اور آرام کی جگہ ہے۔ مگر وہ چند دن کی جھوٹی لذت میں کھویا ہوا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں حاصل کر رہا ہوں حالانکہ وہ صرف ضائع کر رہا ہے۔ دنیا میں مکان بنا کر وہ سمجھتا ہے کہ میں اپنی زندگی کی تعمیر کر رہا ہوں حالانکہ وہ صرف ریت کی دیواریں اٹھا رہا ہے جو اسی لئے بنتی ہیں کہ بننے کے بعد منہدم ہو جائیں۔

انسان اپنے آپ کو پہچان۔ تو کیا کر رہا ہے اور تجھے کیا کرنا چاہیئے! (۱۹۶۰)

سچائی کا اعتراف

گلیلیو (۱۶۴۲-۱۵۶۴) اٹلی کا بہت بڑا سائنس داں تھا۔ اس نے پہلی بار دور بین تیار کی اور علم الافلاک میں بہت سی اہم چیزیں دریافت کیں۔ ساڑھے تین سو سال پہلے اس نے ایک کتاب شائع کی جس کا نام تھا ،، دو بڑے نظام ہائے عالم پر گفتگو ،، اس کتاب میں گلیلیو نے زمین اور شمسی نظام کے مسئلہ پر بحث کی۔ اس نے کوپرنیکس کے اس نظریہ کی تائید کی کہ زمین چپٹی نہیں ہے بلکہ گول ہے اور یہ کہ سورج زمین کے گرد نہیں گھوم رہا ہے بلکہ زمین سورج کے گرد گھوم رہی ہے۔

رومی کلیسا نے اس نظریہ کو مسیحی عقائد کے خلاف قرار دیا۔ کتاب مقدس (تورات اور انجیل) میں اگرچہ یہ مسئلہ درج نہ تھا۔ تاہم مسیحی بزرگوں نے بطور خود اپنے عقیدہ کی جو تفصیلات مرتب کیں ان میں انھوں نے اس نظریہ کو درج کر دیا۔ کلیسا یہ عقیدہ رکھتا تھا کہ کتاب کے متن کی طرح اس کے حواشی بھی مقدس ہیں جو اس کے بزرگوں نے لکھ رکھے ہیں، اس لئے اس نے ان حواشی کو عین دین سمجھا اور اس نے گلیلیو کو بے دین قرار دے دیا۔ اس زمانہ میں کلیسا کو مسیحی دنیا پر زبردست اقتدار حاصل تھا۔ حتی کہ یورپ کے کئی ملکوں (اسپین، اٹلی وغیرہ) میں اس کی متوازی مذہبی عدالتیں قائم تھیں۔ ان عدالتوں کے ذریعہ کلیسا براہ راست خود اپنے اختیار سے ہر قسم کی سزائیں دے سکتا تھا۔

جب گلیلیو نے اپنی غلطی نہیں مانی تو اس کا مقدمہ رومی کلیسا کی مذہبی عدالت میں پیش ہوا۔ اور اس نے اس کو عمر قید کی سزا دے دی۔ اس کے بعد دو سو سال سے زیادہ عرصہ تک کے لئے اٹلی میں علمی تحقیق کا کام رک گیا ——— خدائی متن کے ساتھ بزرگوں کی تشریحات کو مقدس سمجھنے کا یہ بھیانک انجام تھا جو اٹلی کو بھگتنا پڑا۔

کلیسا نے اپنے دائرہ اختیار میں کچھ اہل علم کا خاتمہ کر دیا۔ مگر خود علم کا خاتمہ کر دینا اس کے لئے ممکن نہ تھا۔ کلیسا کا دائرہ اختیار بہر حال محدود تھا۔ جب کہ علم کائناتی بنیادوں پر قائم ہے، علم وہ چیز ہے جس کی جڑیں سارے زمین و آسمان میں پھیلی ہوئی ہیں۔ چنانچہ کلیسا کے مخالفانہ رویہ کے باوجود علم بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ نوبت آ گئی کہ علم کو عمومی بالادستی حاصل ہو گئی۔ کلیسا کا اختیار ماضی کا افسانہ بن کر رہ گیا۔

اب کلیسا کے لئے اس کے سوا کوئی صورت باقی نہیں رہی تھی کہ وہ نئی صورت حال کو تسلیم کرے۔ جس گلیلیو کو وہ اپنے یہاں مرتد اور قابل سزا کے خانہ میں لکھے ہوئے تھا وہ باہر کی پوری علمی

دنیا میں ہیرو کا مقام حاصل کرچکا تھا۔ یہ واقعہ اب کلیسا کی تاریخ میں ایک شرمناک واقعہ بن گیا۔ وہ کلیسا کی غیر علمی روش کے لئے ایک علامتی مثال کی حیثیت رکھتا تھا۔ حتیٰ کہ جو چیز پہلے گلیلیو کا مسئلہ تھی وہ اب خود کلیسا کا مسئلہ بن گئی۔ کیوں کہ گلیلیو کی علمی حیثیت کا اعتراف کئے بغیر کلیسا اپنے اعتماد کو بحال نہیں کرسکتا تھا۔

۱۹۸۰ میں کلیسا نے اس مسئلہ پر نظر ثانی کے لئے آٹھ افراد پر مشتمل ایک خصوصی کمیشن مقرر کیا۔ اس کے ارکان میں مورخ، ریاضی داں اور مسیحی علمار شامل تھے۔ کمیشن طویل غور و خوض اور بحث و مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ علم نے آخری طور پر یہ ثابت کردیا ہے کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے اور اس معاملہ میں یقینی طور پر گلیلیو حق پر تھا۔

اس کے بعد مئی ۱۹۸۳ میں ویٹیکن میں ایک خاص اجلاس ہوا جس میں مورخین، مسیحی علمار اور سائنس دانوں کی بڑی تعداد شریک ہوئی۔ پوپ جان پال ثانی خود بھی اس تاریخی اجتماع میں موجود تھے۔ پوپ نے تمام لوگوں کے سامنے اس معاملہ میں کلیسا کی غلطی کا اعتراف کیا اور گلیلیو کے برسر حق ہونے کا اعلان کیا۔ انھوں نے کہا:

> The Church's experience, during the Galileo affair and after it, has led to a more mature attitude and to a more accurate grasp of the authority proper to her.

گلیلیو کے زمانہ میں اور اس کے بعد کلیسا کے تجربہ نے اس کو زیادہ پختہ نقطہ نظر اور اختیار کے زیادہ صحیح ادراک تک پہنچایا ہے جو اس کے لئے مناسب ہے (گارجین ۲۹ مئی ۱۹۸۳)

یہ تضاد کیوں

کلیسا نے کیوں سترہویں صدی عیسوی میں گلیلیو کا انکار کیا تھا اور بیسویں صدی میں کیوں اس نے گلیلیو کا اقرار کرلیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سترھویں صدی عیسوی میں گلیلیو کی شخصیت ایک متنازعہ (Controversial) شخصیت تھی۔ جب کہ بیسویں صدی عیسوی میں وہ ایک تسلیم شدہ (Established) شخصیت بن چکی ہے۔

ٹھیک یہی معاملہ کلیسا کا ایک اور شخصیت کے ساتھ پیش آیا۔ یہ حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی شخصیت ہے۔ مسیحی کلیسا نے ساتویں صدی عیسوی میں حضرت محمد کا انکار کیا۔ اس انکار کی وجہ یہ تھی کہ ساتویں صدی میں حضرت محمد کی شخصیت ایک متنازعہ شخصیت تھی۔ اب دوبارہ یہ ہوا ہے کہ بیسویں صدی میں پہنچ کر حضرت محمد کی شخصیت ایک ثابت شدہ شخصیت بن چکی ہے۔ آج علم اور تاریخ کے

اتنے شواہد آپ کی نبوت کی تصدیق پر جمع ہو چکے ہیں کہ اب باعتبار حقیقت سی کے لئے اس پر شبہ کرنے کی گنجائش باقی نہیں رہی (تقابل کے لئے ملاحظہ ہو ڈاکٹر موریس بوکیل کی مندرجہ ذیل کتاب ـــــ بائبل، قرآن اور سائنس :

(The Bible, The Quran, and Science)

پھر کیا وجہ ہے کہ جن اسباب کی بنا پر کلیسا نے گلیلیو کو مان لیا، انھیں اسباب کی موجودگی میں وہ حضرت محمد کو نہیں مانتا۔ وہ بدستور آپ کو بناوٹی نبی (False Prophet) کے خانہ میں ڈالے ہوئے ہے۔ اس کی وجہ وہ فرق ہے جو باعتبار نوعیت دونوں شخصیتوں کے درمیان پایا جاتا ہے۔ گلیلیو کو ماننا صرف ایک فنی غلطی کا اعتراف ہے۔ جب کہ حضرت محمد کو ماننا اپنے پورے وجود کی نفی کے ہم معنی ہے۔

گلیلیو ایک فلکیات داں تھا۔ اس کا کیس فلکیاتی علم کا کیس تھا۔ جب کہ حضرت محمد ایک پیغمبر تھے اور آپ کا کیس خدا کی پیغمبری کا کیس۔ یہ فرق دونوں کے معاملہ کو نوعی طور پر ایک کو دوسرے سے جدا کر دیتا ہے۔ گلیلیو کو ماننا صرف ایک علمی سچائی (Scientific truth) کو ماننا ہے۔ اس کے برعکس حضرت محمد کو ماننا ایک مذہبی سچائی (Religious truth) کو ماننا۔ گلیلیو کو ماننا کلیسا کے لئے ایک ایسے خارجی واقعہ کو ماننا تھا جس سے اس کے اپنے اوپر کوئی زد نہیں پڑتی تھی۔ اس کا اپنا مخصوص ڈھانچہ اس کے بعد بھی بدستور برقرار رہتا تھا۔ اس کے برعکس حضرت محمد کو ماننا ایک ایسے واقعہ کو ماننا تھا جس کا براہ راست تعلق اس کے اپنے ڈھانچہ سے تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت محمد کو مانتے ہی پاپائیت اپنے وجود کا جواز کھو دیتی ہے۔ اس کے بعد کلیسا کا پورا محل اچانک زمین پر گر پڑتا ہے۔

حضرت محمّد نے توحید کی تعلیم دی جب کہ موجودہ کلیسا کا سارا ڈھانچہ تثلیث کے عقیدہ پر قائم ہے۔ حضرت محمد نے حضرت مسیح کو خدا کا پیغمبر بتایا جب کہ کلیسا حضرت مسیح کو خدا کا بیٹا قرار دے کر اپنا مذہبی قلعہ تعمیر کئے ہوئے ہے۔ حضرت محمد نے ذاتی عمل کو نجات کی بنیاد قرار دیا، جب کہ کلیسا کا سارا مذہبی ڈھانچہ کفارہ کے عقیدہ پر قائم ہے، وغیرہ۔ ایسی حالت میں کلیسا کیسے حضرت محمد کو مان لے۔

گلیلیو کا اقرار کرنے کے بعد بھی کلیسا کی حیثیت بدستور باقی رہتی تھی۔ جب کہ حضرت محمد کا اقرار کلیسا کے لئے خود اپنے انکار کے ہم معنیٰ ہے۔ اور بلا شبہ دنیا میں ایسے لوگ سب سے زیادہ کم پائے جاتے ہیں جو اس قسم کی جرأت کا ثبوت دے سکیں۔ کلیسا صرف اپنی نفی کی قیمت پر حضرت محمد کو مان سکتا ہے۔ اور اس دنیا میں کون ہے جو اپنی نفی کی قیمت پر کسی سچائی کو ماننے کے لئے تیار ہو جائے۔

کسی حقیقت کے ثابت شدہ ہونے کے دو درجے ہیں۔ ایک ہے اس کا نظری طور پر ثابت ہونا دوسرے اس کا مادی طور پر ثابت شدہ بن جانا۔ غیر مذہبی حقیقت موجودہ دنیا ہی میں آخری حد تک ثابت ہو جاتی ہے۔ جب کہ مذہبی حقیقت موجودہ دنیا میں صرف نظری طور پر ثابت ہوتی ہے۔ مادی یا ظاہری طور پر وہ صرف آخرت کی دنیا میں ثابت شدہ بنے گی۔

یہی وجہ ہے کہ غیر مذہبی حقیقت کو لوگ فوراً مان لیتے ہیں۔ کیوں کہ اس کے معاملہ میں انسان کے لئے انکار کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ اس کا انکار کرنا اپنے آپ کو انسانیت کے قافلہ سے کاٹ لینے کے ہم معنی بن جاتا ہے۔

اس کے برعکس مذہبی حقیقت کو اکثر حالات میں آدمی ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ کیوں کہ موجودہ دنیا میں وہ صرف نظری طور پر ثابت ہوتی ہے۔ اس کا حسّی اور ظاہری اثبات صرف آخرت کی دنیا میں ہوگا۔ اس بنا پر یہاں آدمی کے لئے ہمیشہ یہ گنجائش موجود رہتی ہے کہ وہ کچھ نہ کچھ الفاظ بول کر اس کا انکار کر دے۔

مگر یہی آدمی کا اصل امتحان ہے۔ نظری دلائل کی سطح پر حقیقت کو پہچاننے ہی کا دوسرا نام ایمان ہے، اور ایمان کے بغیر کسی کو خدا کی جنت نہیں مل سکتی۔ قیامت میں تمام لوگ مجبور رہوں گے کہ وہ حقیقت کا اعتراف کریں۔ کیوں کہ وہاں حقیقت اپنی آخری اور کامل صورت میں ظاہر ہو جائے گی۔ مگر دنیا میں حقیقت کو وہی لوگ مانتے ہیں جو کسی چیز کو اس کے معنوی جوہر کے اعتبار سے پہچاننے کا حوصلہ رکھتے ہوں گویا جو کچھ عام لوگوں پر قیامت کے دن گذرنے والا ہے وہ مومن پر اسی دنیا میں گذر جاتا ہے۔ وہ دیکھنے سے پہلے دیکھ لیتا ہے۔

یہ " دیکھنے سے پہلے دیکھنا " ہی دراصل جنت کی قیمت ہے۔ جو اس کا ثبوت دے وہی وہ شخص ہے جس کو خدا کی ابدی جنت میں داخلہ ملے گا۔

''اسلام عصرِ حاضر میں'' ویسا ہی ایک جملہ ہے جیسا کہ ''سورج عصرِ حاضر میں''

اسلام، بالفاظِ دیگر خدا کی سچی ہدایت، ابدی حقیقتوں کا اظہار ہے۔ انسان کو اپنی زندگی کی مادّی تعمیر کے لئے جس طرح سورج کی روشنی کی مستقل ضرورت ہے، اسی طرح اس کو اپنی زندگی کی روحانی اور اخلاقی تعمیر کے لئے خدا کی سچی ہدایت کی لازمی ضرورت ہے — حقیقت یہ ہے کہ سورج کے بغیر آدمی کی دنیا اندھیری ہے اور ہدایت کے بغیر آدمی کی آخرت اندھیری۔
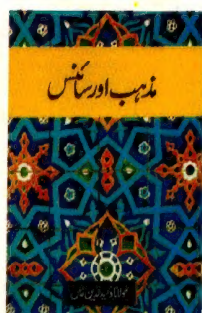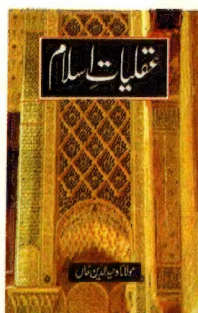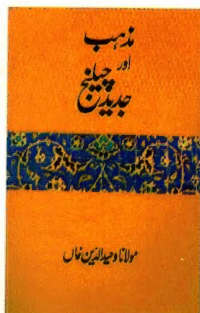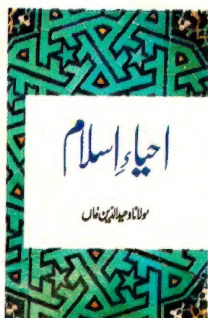
ISLAMIC STUDIES
GOODWORD
www.goodwordbooks.com
ISBN 978-81-7898-868-9
9 788178 988689
₹ 50